لفظوں کی انجمن میں

سیّد حامد حسین

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

Lafzon Ki Anjuman Main
by
Syed Hamid Husain
Rs.62/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 تعداد: 1100 قیمت: -/62روپے
ISBN :978-81-7587-646-0 سلسلہ مطبوعات: 1529

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور'' معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلّی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

منیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

فہرست

پیش لفظ

مجھے یاد نہیں کہ لفظوں نے مجھے اپنے رومان کا کب اسیر بنایا لیکن یہ کہانی ہے بہت لمبی۔ تیس سال چالیس سال یا ہو سکتا ہے کہ پینتالیس سال پرانی۔ جب لفظوں کے معاملات سمجھنے کا شعور پیدا ہوا تو ڈائریاں بھرنا شروع ہوئیں۔ لفظوں کی دنیا کے عجائبات، ان کے ڈرامائی سفر، ان کے رشتے اور ان کے تضادات اپنا طلسمی جال پھیلاتے گئے۔ جب اٹھارویں ڈائری تین چوتھائی بھر چکی تو کچھ ویسی ہی تحریک پیدا ہوئی جو سیاح اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ اپنا سفر نامہ لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہے اور اس نے اس سلسلے کو جنم دیا جو اردو کے کئی اخباروں میں "لفظوں کی داستان" اور ہندی میں "شبدوں کا سفر" کے عنوان سے گذشتہ دس سال کے دوران چھپتا رہا ہے۔

ہوا یوں تھا کہ انگریزی اور بعض ہندی کے اخبارات میں تصویروں والی کہانیوں یا معلوماتی فیچر سلسلہ وار چھپنے کا رواج برسوں سے تھا لیکن اردو میں ایسے سلسلوں کا کوئی چلن نہیں تھا۔ سمجھ میں یہ آیا اس کمی کی ایک وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اردو میں سلسلہ وار پیش کرنے کے لائق ضروری مسالہ فراہم نہیں ہے، چنانچہ یہ خواہش ہوئی کہ الفاظ کی کہانیوں پر مشتمل ایک سلسلے کو بطور تجربہ متعارف کرایا جائے۔ اطمینان اس وقت ہوا جب یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب یہ بھی سن لیجیے کہ یہ اطمینان کس طرح حاصل ہوا۔ اردو میں یہ رواج ہے کہ جس چیز کو عام قبولیت حاصل ہو جاتی ہے، وہ قومی ملکیت بن جاتی ہے اور اس کی اتنی ہی تیز بلا اجازت نقل کی جانے لگتی ہے چنانچہ جب مجھے الگ الگ مقامات پر سکونت پذیر اپنے احباب کے خطوط سے یہ پتا چلا کہ انھوں نے "لفظوں کی داستان" تو کسی مقامی اخبار کے صفحے پر چھپا دیکھا ہے تو اس امر سے حیرت تو ہوئی ہی کہ میری اطلاع کے بغیر یہ قسط کیسے

چھپ گئی لیکن بعد میں یہ سوچ کر ضرور اطمینان ہوا کہ شاید میری گود کا بچہ اتنا دل موہ لینے والا ہے کہ اسے گود لینے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ اسی خوبی کی بنا پر ہی تو آخر کار ہمارے کلچر کی فراخ دلی کی مثال دی جاتی ہے۔

لفظوں کی ان کہانیوں کو یہاں بعض عنوانات کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے لیکن ان مضامین کو مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ جا بجا بے شمار خلائیں ہیں۔ پھر بھی جو کچھ ہے وہ شاید آپ کو کسی نئی حقیقت سے متعارف کرا دے، آپ کے اُس تجسّس کو تھوڑی بہت تشفی بخشے کہ یہ لفظ کہاں سے اور کیسے آیا اور اس سے قریب کی دوسری دلچسپ باتوں کو بھی آپ کی معلومات کے دائرے میں لے آئے۔

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ موقع ملا تو کچھ دوسری نوع کے لفظوں کے بارے میں پھر کبھی آپ سے گفتگو ہو گی۔ اس مجموعے میں جو مضامین یکجا کیے گئے ہیں اُن میں سے بیشتر "کتاب نما" میں چھپ چکے ہیں۔ بعض دوسرے مضامین "ایوان اردو" "زبان وادب"، "ہماری زبان"، "قومی راج" وغیرہ کے صفحات پر جگہ پا چکے ہیں۔

اس کتاب کے پیچھے تحریک مہیا کرنے والی جو طاقت ہے، اس کا نام شاہد علی خاں ہے۔ ان پراگندہ مضامین نے جو شکل اختیار کی ہے وہ دراصل شاہد صاحب کا ہی فیضان ہے۔

سید حامد حسین

بھوپال ۱۱ر نومبر ۱۹۹۶ء

پیشوں اور پیشہ وروں کے نام

ہماری سماجی زندگی میں پیشوں اور ان سے وابستہ خدمتوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کے ان پیشوں یا خدمتوں کے براہ راست بیان سے پرہیز کیا جاتا ہے اور غالباً ان پیشہ وروں کی دل آزاری سے بچنے کی غرض سے انھیں ایسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جو ان کی خدمتوں کے جانب محض بالواسطہ اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان ناموں کا مطالعہ بجائے خود بڑا دلچسپ موضوع ہے۔

خدمتگار کے لیے بالعموم "ملازم" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ عربی لفظ دراصل "لزوم" سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب چسپاں یا پیوستہ ہوتا ہے اور ملازم سے وہ شخص مراد لیا گیا ہے جو اپنے مالک کے ساتھ چسپاں رہے اور ہر وقت حاضر و موجود رہے۔ یعنی یہ انگریزی لفظ اٹنڈنٹ کا مترادف ہے۔ بعض اوقات ہمیں کسی کام کرنے کے لیے مزدور رکھنا پڑتا ہے۔ مزدور دو لفظوں "مزد" اور ور" سے مرکب ہے "مزد" کا مطلب صلہ یا معاوضہ ہے اور اس طرح مزدور سے وہ شخص مراد ہے جس کی خدمات اجرت پر لی گئی ہیں۔ یعنی وہ بیگاری نہیں ہے جس سے بلا معاوضہ کام لیا جائے۔ عام زبان میں "مزدور" کا لفظ مجور' کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ محض اتفاقی بات ہے کہ "مجور" اس عربی لفظ "ماجور" سے معنوی اعتبار سے بڑا قریب ہے جس کے معنی صلہ پانے والے کے ہوتے ہیں۔

خدمتگار کے لیے عام طور پر 'نوکر' کا لفظ استعمال میں آتا ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ چنگیز خاں اپنے بیٹے تولی خاں کو 'نوکر' کہا کرتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداء لفظ "نوکر" کے معنی خدمت گار کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتے ہیں۔ یوں خادم لڑکا یا چھوکرا کہنے کا رجحان کئی زبانوں میں ملتا ہے۔ انگریزوں نے ہندستان 'ملایا' چین 'ویسٹ انڈیز وغیرہ علاقوں میں نوکر کو بوائے کہہ کر پکارنے کا رواج ڈالا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سلیو بوائے

(Slave Boy) کا مخفف ہے یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب خدمت گاروں کو پیسے دے کر خرید لیا جاتا تھا۔ ان زر خرید خدمت گاروں کے لیے اردو میں "غلام" کا استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ اس عربی لفظ کے اصل معنی ایسا نوجوان لڑکا ہیں جس کے چہرے پر مونچھیں اور داڑھی ابھی صرف روئیں کی شکل میں نمودار ہو رہی ہوں۔ (اردو میں اس لفظ کو اپنے اصل معنی میں "اغلام" میں دیکھا جا سکتا ہے) اردو میں زر خرید خادم کے لیے بھی ایک ایسا لفظ ایجاد کیا گیا ہے جو متعلقہ فرد کی دل آزاری کا سبب نہ بن سکے جب کہ بعض دوسری زبانوں میں اس نوع کے الفاظ میں نفرت و حقارت کی بو محسوس کرنا دشوار نہیں۔ انگریزی لفظ سلیو (Slave) کی ابتداء کو تلاش کرتے ہوئے ہم وسط یوروپ کی سلاو (Slav) قوم تک پہنچ سکتے ہیں جس کا وطن موجودہ سرویا، چیکو سلویکیہ کے آس پاس تھا سنسکرت میں غلام کے لیے "داس" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ دراصل "داس" اور "دسیو" دو قومیں تھی جن سے آریاؤں کو وسط ایشیا سے ہندستان کی جانب پیش قدمی کرتے وقت سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن جنھیں آریاؤں نے بالآخر مغلوب کر لیا۔

خدمت گاروں کا ایک طبقہ وہ ہے جنھیں "قلی" کہا جاتا ہے اور جو لال وردی میں ملبوس ریلوے اسٹیشنوں پر سامان اتارتے چڑھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لفظ "قلی" کو انگریزوں نے کافی رواج دیا بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ قلی (Coolie) وہ مزدور کہلاتے تھے جو کمروں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے چھت سے لٹکنے والے جھالر دار پنکھوں کو ڈوری سے کھینچ کر جھلایا کرتے تھے حقیقت یہ ہے کہ انگریز ہر مزدور اور بوجھ اٹھانے والے کو قلی کہتے تھے۔ چنانچہ جو لوگ ماریشس، ویسٹ انڈیز، ملایا وغیرہ مزدوری کی غرض سے گئے وہ بھی قلی کہلائے۔ دراصل "قلی" لفظ "کولی" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ کولی ذات کے لوگ مغربی ہندستان میں خاص طور پر گجرات اور کوکن علاقوں کے باشندے ہیں۔ ذات پات کی تقسیم میں کولی چمار سب سے نچلی ذاتوں میں شمار کیے جاتے تھے اور بے انتہا غربت کی وجہ سے یہ معمولی سے معمولی کام کرنے کے لیے تیار رہتے تھے اور اس طرح ان کا نام ہی مزدور کا مترادف بن گیا۔ انگریز اس لفظ کا "تلفظ" کاف سے کرتے تھے اردو میں یہ قاف کے ساتھ رائج ہوا۔ اس کی وجہ ترکی لفظ قلی سے مماثلت تھی۔ ترکی لفظ غلام کے لیے بولا جاتا تھا اور ناموں میں عبد (جیسے عبد القادر) یا "غلام" (جیسے غلام قادر) کی طرح جنوبی ہند اور

دوسرے علاقوں میں (علی قلی خاں میں) مستعمل تھا۔

بوجھ اٹھانے والوں کے لیے عام طور پر عربی لفظ "حمال" استعمال کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ایسے مزدوروں کے لیے جو سواریوں سے بھاری تجارتی سامان اتارنے یا ان پر لادنے کا کام کرتے ہیں لیکن ایک اور قسم کا بوجھ اٹھانے والے آج کل ہوٹلوں میں بیرے بن گئے ہیں۔ "بیرا" انگریزی لفظ "بیرر" (BEARER) کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ انگریز شروع میں اس لفظ کو پالکی اٹھانے والوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ عام طور پر کہار ذات کے ہوتے تھے جو دریا یا کنوئیں سے برتنوں میں پانی بھر کر امیروں اور زمینداروں کے گھر پہنچاتے تھے۔ انھیں ان گھروں میں برتنوں وغیرہ کی صفائی کے لیے بھی ملازم رکھا جاتا تھا۔ انگریزوں کے یہاں بھی اس کام کے لیے کہار لگائے گئے۔ جو ضرورت پڑنے پر پالکی بھی اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلتے اسی مناسبت سے انگریزوں نے ان خدمت گاروں کو جو کھانے کی میز پر کھانا پہنچانے کا کام کرتے تھے "بیرر" کہنا شروع کیا اور صاف ستھری سفید وردی میں ملبوس یہ خدمت گار ہندستانی زبان میں بیرے ہو گئے۔

خدمت گاروں کا ایک طبقہ وہ ہے جو جہازوں پر معمولی خدمتیں سرانجام دیتا ہے اور خلاصی کہلاتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی بتاتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل خلاسی ہے۔ عربی میں "خلس" ملے جلے، سیاہ اور سفید کو کہتے ہیں اور "خلاسی" اس بچے کو کہا جاتا ہے جس کے ماں باپ میں سے ایک گورا اور ایک کالا ہو۔ اس قسم کی ملی جلی نسل کے لوگ اکثر بندرگاہوں کے آس پاس کے علاقے میں پائے جاتے ہیں اور کیونکہ ان کی معاشی حالت اچھی نہیں ہوتی تھی اس لیے کشتیوں اور جہازوں پر مزدوری کیا کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے جہازوں پر مزدوری کرنے والے ہر قسم کے لوگ خلاصی کہنے لگے۔

کشتی چلانے والے کو ہم ملاح کہتے ہیں لیکن یہ لفظ جس عربی لفظ سے نکلا ہے اس کا مطلب کھارا یا نمکین ہوتا ہے۔ کیونکہ سمندر کا پانی کھارا ہوتا ہے۔ اس لیے اشارۃً کھارے پن سے سمندر بھی مراد لینے لگے۔ ملاح شروع میں سمندر کے پانی سے نمک بنانے والے کو کہتے تھے۔ پھر سمندر میں جانے والے کو ملاح کہنے لگے اور اب کسی بھی کشتی والے کو ملاح کہا جانے لگا۔ چاہے وہ سمندر کے کھارے پانی میں اپنی کشتی چلائے یا ندی میں یا جھیل کے میٹھے پانی میں۔

اوپر ہم نے لفظ "بیرا" کا ذکر کیا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے فارسی لفظ خانساماکو بھی اپنایا تھا، حالانکہ انھوں نے اس کے مفہوم کو بہت محدود کر دیا۔ عہد مغلیہ میں خانساماں ایک باعزت اور بااختیار عہدہ ہوا کرتا تھا۔ خانساماں شاہی محل کے اسباب و سامان کا ذمہ ہوتا تھا۔اور شاہی محل کی ساری ضرورتوں کا اہتمام اور سارے سامان کی نگہداشت کرتا تھا۔ اسے بعض اوقات میر سامان کا نام بھی دیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں خانساماں کی ذمہ داریاں باورچی خانے تک محدود ہو گئیں اور اس کا کام کھانا تیار کرنا یا کروانا ' کھانے کو میز تک پہنچانا اور کھانے کے دوران ضروری خدمت کے لیے حاضر رہنا ہو گیا۔

یہی حال کچھ باورچی کے ساتھ ہوا۔ بادشاہوں اور نوابوں کے ساتھ ساتھ باورچی کی قدر و منزلت بھی جاتی رہی۔ایک وقت وہ تھا جب باورچی نہایت بھروسے والا شخص سمجھا جاتا تھا۔ورنہ کون جانے کون سی سازش کھانے میں زہر شامل کر کے امیر کی جان لے لے۔ یہی وجہ ہے کہ باور کرنے کا مفہوم "یقین" کرنا ہو گیا لیکن یہ تو سب بعد کی بات ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی بتاتے ہیں کہ اصل میں "با" کے معنی کھانا یا کھانا پکانا کے تھے۔اس لیے باور کے معنی ہوئے کھانا پکانے کے فن کا ماہر یا استاد۔ اسی مناسبت سے نان بائی روٹی پکانے والا ہوا اور "بازار" شروع میں وہ جگہ تھی جہاں کھانا پکا پکایا ملے۔

روزمرہ کے کاموں میں مدد دینے والوں کے نام شروع میں ان کے پیشوں کی بنا پر رکھے گئے جیسے سنسکرت لفظ "کمبھ کار" یعنی برتن بنانے والے سے کمہار اور "چرم کار" یعنی چمڑے کا کام کرنے والے سے چمار کے لفظ بنے لیکن جوں جوں تہذیب و شائستگی کا اثر گہرا ہوتا گیا پیشہ وروں کے لیے نئے اور غیر راست الفاظ زیادہ رائج ہوتے گئے۔ مثلاً جوتا بنانے والے کے لیے موچی کا لفظ اختیار کیا گیا جو فارسی لفظ موچک سے بنایا گیا تھا جس کا مطلب گھٹنوں تک پہنچنے والا جوتا ہوتا تھا۔ پیشے کے طور پر کپڑا سینے والے کو درزی کا نام دیا گیا جو کہ درز یا شگاف کو سوئی دھاگے سے سینے کا کام کرتا تھا۔ بعض اوقات اسے عربی لفظ "خیاط" سے بھی پکارا گیا، کیونکہ خیط لفظ کے معنی دھاگے کے ہوتے ہیں جس کی مدد سے درزی سینے کا کام کرتا ہے۔

گھر کے کام کے لیے مشک میں پانی بھر کر لانے والے کو پہلے سقہ یعنی پانی پلانے والا کہا گیا لیکن بعد میں اسے بہشتی کا نام دیا گیا، کیونکہ پانی پلانے والا بہشت کا حقدار ہوتا

ہے۔ پھر بہشتی بگڑ کر بھشتی ہو گیا۔

کوڑا کرکٹ دور کرنے والے اور غلاظت اور گندگی کو صاف کرنے والے کو "بھنگی" کہہ کر یاد دلایا گیا کہ اس قسم کے لوگ بھنگ وغیرہ پی کر نشہ کرتے ہیں لیکن بعد میں شرافت کے تقاضے نے اس پر آمادہ کیا کہ بجائے حقارت کے مخاطب کرنے کہ انھیں "مہتر" کہا جائے۔ "مہتر" کی اصطلاح رئیس اور سردار قوم کے لیے استعمال ہوتی تھی جیسا کہ پاکستان میں شامل ریاست چترال کے امیر کو "مہتر" چترال کہا جاتا تھا۔ بھنگیوں کے لیے اس اصطلاح کا استعمال کیے جانے کا سبب یہ ہوا کہ اصطبل کے داروغہ کو "مہتر اسپ" کہا جاتا تھا۔ بعد میں سائیس کو مہتر کہا جانے لگا اور اس کے بعد اصطبل کی غلاظت صاف کرنے والے کو اس نام سے موسوم کیا گیا اور پھر تو کہیں کی غلاظت اٹھانے والے کے لیے یہ نام عام ہو گیا۔ کبھی ان لوگوں کو "حلال خور" کہہ کر اس بات سے چشم پوشی کرنے کی کوشش کی گئی کہ انھیں مردار کھانے سے کوئی پرہیز نہیں ہوتا۔ آج کل یہ لگتا ہے کہ مہتر کا لفظ بھی بہت واضح ہو گیا ہے چنانچہ "جمعدار" کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے۔ جمعدار یعنی جماعت دار کا لفظ شروع میں فوج کے دوسرے نمبر کے اعلا افسر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد میں اسی حیثیت کے پولس افسر کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا لیکن ایسا لگتا ہے کہ صفائی کرنے والے خادم کے لیے جمعدار کا لفظ جماعت کی وجہ سے نہیں بلکہ (کچرا وغیرہ) جمع کرنے والے کو فوجی افسر جیسی عزت کا احساس دلانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے

بال کاٹنے اور ڈاڑھی بنانے کے کام کو حجامت کرنا کہا جاتا ہے لیکن عربی میں حجام کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ پچھوایا سینگی لگا کر جسم کا فاسد خون نکالنے والے کے ہیں۔ کیونکہ ہندستان میں اس قسم کا کام بھی نائی کیا کرتے تھے۔ اس لیے نائی کو ہی بالواسطہ حجام بھی کہا جانے لگا۔

لفظ "قصائی" کا املا ابھی بھی بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اکثر لوگ اسے صاد سے لکھتے ہیں اور وہ اسے اسی معنی میں عربی لفظ قصّاب کی بدلی ہوئی شکل سمجھتے ہیں۔ "قصاب عربی لفظ "قصب" سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب ٹکڑے پارچے کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ قصائی گوشت کے پارچے کرتا ہے اس لیے یہ لفظ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض زباندان یہ سفارش کرتے ہیں کہ اس لفظ کو سین سے "قسائی" لکھا جائے۔ کیونکہ وہ سمجھتے

ہیں کہ یہ لفظ قساوت سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب دل کی سختی اور بے رحمی ہوتا ہے اس طرح یہ لفظ بالواسطہ جانوروں کو ذبح کر کے ان کا گوشت فروخت کرنے والے کے پیشے کو ظاہر کرتا ہے۔

پھولوں کے پودوں کی نگہداشت اور باغ کی دیکھ بھال اور اس کے رکھ رکھاؤ کا کام کرنے والے کو عام طور پر "مالی" کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ لفظ "مالا" کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ شخص مراد ہے جو پھولوں کو گوندھ کر ان کے ہار بناتا ہے لیکن اب اس لفظ کے معنی کو کافی توسیع دی جاچکی ہے۔

پرتگالیوں نے ہماری زبان کو کاریگر کے معنی میں ایک اہم لفظ دیا ہے۔ "مستری" کا لفظ پرتگالی لفظ ہے۔(Mestre) کی بدلی ہوئی شکل ہے اور پرتگالی زبان کی طرح ہی یہ کئی قسم کے کاریگروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر اسے فورمین یا ہیڈ کاریگر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن راج مستری کہہ دیوار اٹھانے والے کو مراد لیا جاتا ہے۔ جنوبی اور مغربی ہندستان میں بعض اوقات باورچی اور درزی کو بھی مستری کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جو غالباً ہندستان میں مقیم پرتگالیوں کا اثر ہے۔

انگریزوں نے ہمیں "پلمبر" کا لفظ دیا ہے جو اس کاریگر کے لیے استعمال ہوتا ہے جو غسل خانے وغیرہ میں پانی کے نلوں، پائپوں وغیرہ کے فٹ کرتا ہے یا ان کی مرمت کرتا ہے۔ دراصل یہ ایک لاطینی لفظ ہے "پلمبم" سے نکلا ہے جو سیسے کی دھات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ شروع میں غسل خانوں وغیرہ اکثر سیسے کے پائپ، ٹب استعمال ہوتے تھے یا سیسے کی مدد سے لوہے کے پائپوں یا ٹنکیوں وغیرہ میں سے پانی کو رسنے سے روکا جاتا تھا۔ اس لیے ان کا کام کرنے والوں کو پلمبر کہنے لگے۔

علاج معالجے سے متعلق تین الفاظ حکیم، وید اور ڈاکٹر، بنیادی طور پر علاج کی نہیں بلکہ عقل، علم اور فراست کی یاد دلاتے ہیں۔ لفظ حکیم کا تعلق حکمت و دانائی سے ہے اور قدیم فلسفیوں اور مفکروں کو اکثر حکیم کے لقب سے پکارا جاتا ہے، جیسے حکیم افلاطون، حکیم ارشمیدس وغیرہ۔ کیونکہ قدیم یونانی طریقۂ علاج کے بانی یونانی فلسفی تھے (جیسے حکیم جالینوس) اس لیے بعد میں حکیم کا لفظ طبیب اور معالج کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ اسی طرح لفظ "وید" کی اصل "ود" کا وہ سنسکرت مادہ ہے جس کا مطلب جاننا ہے اور جس

سے تعلیم کے معنی میں "ودیا" بنا ہے۔ وید کے معنی علم کے ہیں اور بعد میں یہ لفظ بھجنوں اور پرار تھناؤں کے مجموعی کے لیے استعمال ہونے لگا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ مجموعے مذہبی علم کا خزانہ تھے جو لوگ ان پرار تھناؤں وغیرہ سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں وید یہ کہا جانے لگا۔ ان لوگوں کی روحانی طاقت پر عقیدہ رکھنے والے ان لوگوں کے پاس علاج کے لیے بھی جانے لگے۔ پھر علاج کرنے والوں کو بھی تعظیماً "وید" کہا جانے لگا اور طریقۂ علاج کو "آیوروید" "یعنی زندگی کا وید" نام دیا گیا۔ ڈاکٹر کا بنیادی مفہوم تعلیم دینے والے کا ہے اور ایک زمانے میں اس سے کسی بھی شعبۂ علم کے فاضل کو مراد لیتے تھے۔ چنانچہ پادریوں کو فاضل دینیات ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر آف چرچ کہا جاتا تھا۔ بعد میں کسی یونیورسٹی کی کسی اونچی ڈگری حاصل کرنے والے کو ڈاکٹر کہنے لگے۔ جیسے ڈاکٹر آف فلاسفی یا ڈاکٹر آف سائنس۔ اسی طرح یونیورسٹی سے طب کی ڈگری لے کر نکلنے والے کے لیے ڈاکٹر کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ آپریشن کر کے علاج کرنے والے کو "سرجن" کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ ایک جرمن لفظ پر مبنی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ہاتھ سے کام کرنے والا اس وقت تک زیادہ تر معالج مریضوں کا دواؤں سے علاج کیا کرتے تھے لیکن جب کچھ لوگوں نے جراحی کا کام شروع کیا اور انھوں نے چیڑ پھاڑ کے ذریعے علاج کا طریقہ اپنایا تو یہ کہا جانے لگا کہ یہ لوگ بجائے دواؤں کے اپنے ہاتھوں سے لوگوں کا علاج کرتے ہیں۔ طبی دواؤں کو طبیب کے نسخے کے مطابق تیار کر کے دینے والے کو عطار کہتے ہیں حالانکہ یہ لفظ دراصل عطر تیار کرنے والے یا اس کا بیوپار کرنے والے کے لیے بنا تھا۔ یوروپ میں دوافروش کو کیمسٹ کہا گیا۔۔ قرون وسطی میں کیمیا بنانے کی دھن عام تھی اور جس شخص کو جڑی بوٹیوں دھاتوں اور دوسرے مادوں کا علم ہوتا تھا اسے کیمیاگر سمجھا جاتا تھا چنانچہ یہ لفظ دوافروشوں کے لقب کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

تعلیم و تدریس کے میدان میں استاد کا کلیدی کردار ہے لیکن لفظ استاد نے ایک خاص سماجی پس منظر میں جنم لیا تھا۔ اس کا تعلق زرتشتوں کی مقدس کتاب "اوستا" سے ہے۔ پہلوی زبان میں اوستاود "ان لوگوں کو کہتے تھے جو اپنی ساری عمر اوستا کے مطالعے اور اس کی تعلیمات پر بحث و مباحثے میں گزار دیتے تھے ان کا ایک کام دوسروں کا اوستا پڑھانا اور سمجھانا بھی ہوتا تھا۔ بعد میں یہ لفظ کسی بھی معلم کے لیے استعمال ہونے لگا۔ انگریزی

لفظ "ماسٹر" بھی اکثر استاد کے لیے مستعمل ہے، حالانکہ اس کے اصل معنی "مالک" کے ہوتے ہیں دراصل یہ لفظ اسکول ماسٹر کا مخفف ہے اور اس زمانے کی یاد دلاتا ہے جب بعض لوگ بچوں کو تعلیم دینے کے لیے بورڈنگ اسکول کھول لیا کرتے تھے جس کے وہ خود مالک بھی ہوتے تھے اور خود ہی بچوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے تعلیمی اداروں کے سربراہ کو آج کل پرنسپل کہا جاتا ہے جبکہ اس لفظ کے اصلی معنی "خاص یا اہم" کے ہوتے ہیں۔ دراصل یہ "پرنسپل ٹیچر" تھا جو ہیڈ ماسٹر کی طرح سب سے بڑے معلم کے لیے بولا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کے چانسلر کی داستان اور ہی ہے۔ لفظ چانسلر کی ابتدا کو تلاش کرتے ہوئے ہم ایک ایسے لاطینی لفظ تک پہنچ سکتے ہیں۔ جس کے معنی کیکڑے کے ہوتے ہیں۔ بعد میں اس سے ایک اور لفظ "بانس" لکڑی یا لوہے کی جالی کو بتانے کے لیے بنایا گیا۔ اس قسم کی جالیاں عام طور پر گرجا کے اس حصے کو علاحدہ کرنے کے لیے لگائی جاتی تھی جہاں پادری بیٹھا کرتے تھے۔ چانسلر کا لفظ سب سے پہلے اس دربان کے لیے استعمال کیا گیا جو گرجا میں قائم عدالت کی جالی کے باہر تعینات کیا جاتا تھا۔ پھر اسے عدالتوں کے چپراسی کے لیے بولا جانے لگا بعد میں عدالت کے سکریٹری اور نوٹری کو اس نام سے پکارنے لگے اور دھیرے دھیرے چانسلر کو مقدموں پر فیصلہ دینے کے اختیارات حاصل ہو گئے اور اب انگلستان میں اعلیٰ ترین قانونی اختیارات رکھنے والا عہدے دار لارڈ چانسلر کہلاتا ہے اور جرمنی وغیرہ بعض ملکوں میں ملک کے سربراہ کو چانسلر کہتے ہیں اسی طرح یونیورسٹی کے معاملات میں اعلاترین اختیارات رکھنے والے عہدے دار کو بھی چانسلر کہنے کا رواج پڑا۔

دفتری دنیا میں کلرک کا اپنا مقام ہے لیکن لفظ کلرک نے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ یونانی زبان کے جس لفظ سے "کلرک" بنا ہے۔ اس کے معنی نصیب یا قسمت کے ہیں اور اس سے ورثے یا ترکے کا مطلب لیا جاتا ہے۔ عیسائی اس سے حصہ کا مطلب لینے لگے اور اس سے وہ چھوٹا پادری مراد لیا گیا جو رسوم کی ادئیگی میں گرجا میں بڑے پادری کے ساتھ حصہ لے۔ پھر کیونکہ اس قسم کی مذہبی معلومات رکھنے والے پادری تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ کلرک کا مطلب تعلیم یافتہ ہونے لگا اور یہ کلرک گرجا کا حساب کتاب اور دوسرا تحریری ریکارڈ رکھنے لگے سولھویں صدی تک اس لفظ کے ساتھ مذہبی مفہوم ختم ہو گیا اور لکھنے پڑھنے اور دفتری کام کرنے والے کو ہی کلرک کہنے لگے۔ ہندستان میں انگریزوں نے

کلرک کو بابو کہنے کارواج ڈالا، حالانکہ مشرقی ہندستان میں بابو کا لفظ زمین داروں اور دوسری حیثیت کے مالک لوگوں کے نام کے ساتھ تعظیماً استعمال کیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے بنگال میں اپنی حکومت کے دوران ہندستانی کارندوں کو بابو کے نام سے پکارنا شروع کیا۔ پھر بابو سے ایسا کلرک مراد لیا جانے لگا جو انگریزی میں دفتری کام کر سکتا ہو اور اب تو یہ لفظ کلرکوں کے لیے عام ہو گیا ہے۔ دفتروں میں تحریری کام کرنے والوں کے لیے ایک قدیم لفظ منشی بھی تھا۔ یہ لفظ عربی لفظ "انشاء" پر مبنی ہے اور انشا پردازی سے ایسی تحریر مراد لی جاتی ہے جو ادبی وصف کے مالک ہو۔ ان معنوں میں منشی پریم چند صحیح معنوں میں منشی کہلانے کے مستحق ہیں لیکن دفتری زبان میں ہر ایسا اہلکار منشی کہلانے لگا جو دستاویزات اور فرامین تیار کرتا ہو یا دفتری خط و کتابت کو سنبھالتا ہو۔

دفتروں میں سامان، کاغذات کو اٹھانے رکھنے یا لانے لے جانے کے لیے جن لوگوں کی خدمت لی جاتی ہے ان کے لیے کئی اصطلاحات جیسے اردلی چپراسی پیون وغیرہ استعمال کی جاتی ہیں۔ اردلی تو انگریزی لفظ (Orderly) کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ لفظ فوج میں استعمال ہوتا تھا اور اسے سارجنٹ یا غیر کمیشن یافتہ افسر کے لیے بولا جاتا تھا جو اپنے سے بڑے افسر کے لیے سرکاری پیغامات لے جائے۔ بعد میں یہ دوسرے معمولی کام کرنے والے خدمتگاروں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ چپراسی کا لفظ یوں تو نیا نہیں ہے لیکن انگریزوں کے عہد میں اس نے ایک خاص رسمی اہمیت حاصل کی۔ اس بارے میں یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس لفظ کا تعلق فارسی الفاظ "چپ" اور "راست" سے ہے یا نہیں یا ان سے بادشاہ کے جلو میں دائیں بائیں پھریرے لے کر چلنے والے سپاہی مراد ہیں لیکن اس بات کا علم ہے کہ انگریزوں نے ان ملازموں کو دفتری عملے کا حصہ بنا کر انھیں وردی کے ساتھ ساتھ کپڑے کی پٹی یا چمڑے کی پیٹی پہننے کے لیے پابند کیا جس میں پیتل کا ایک بلا لگا رہتا تھا اور اس پر محکمے کا نام کھدا ہوتا تھا۔ یہ بلا چپراس کہلاتا تھا اور اسے پہننے والا چپراسی۔ جنوبی ہندستان میں چپراسی کے مقابلے میں پیون (PEON) کا لفظ زیادہ مستعمل رہا۔ اپنی زبان کے اس لفظ کا اصل مفہوم پیادہ ہے اور یہ بنیادی طور پر فوج اور پولس میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعد میں یہ چپراسی کے مترادف ہو گیا۔ فوج کی مناسبت سے پولس میں سپاہی بھی ہونے لگے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں جب فوج کا محکمہ منظم ہوا تو کانسٹبل کا لفظ بھی

رواج میں آیا "کانسٹبل" کے لفظ نے بھی بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ یہ لفظ دو لاطینی الفاظ سے نکلا تھا جن کا مطلب "اصطبل کا ساتھی" ہوتا ہے۔ کانسٹبل نے اصطبل کے خدمت گار کی حیثیت سے ابتدا کی لیکن بعد میں اس نے کبھی قلعہ دار کی حیثیت حاصل کی تو کبھی ریاستی انتظامیہ میں اس نے اعلاترین مقام حاصل کیا۔ اس وقت بھی اس کو انگلستان میں ایک بااختیار اعلا حیثیت حاصل ہے لیکن ہندستان میں کانسٹبل کا درجہ محض سپاہی جیسا ہے

پیشہ وروں کے ناموں کا موضوع کافی طویل ہے لیکن یہاں بات ختم کرنے سے پہلے پیشہ ور عورتوں سے متعلق بعض الفاظ پر نظر ڈالنا بھی مناسب ہوگا۔ "لونڈی" یا "باندی" جیسے الفاظ ابتداءً زر خرید یا قیدی خادماؤں کے استعمال کیے جاتے تھے۔ یوروپ والوں کے ساتھ لفظ "آیا" ہمارے یہاں پہنچا۔ "آیا" ایک پرتگالی لفظ ہے "جس کا مطلب نرس یا گورنس ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کا کام محض بچوں کی دیکھ بھال نہیں رہا بلکہ "آیا" کا لفظ مالکہ کی خاص خادمہ کے لیے مخصوص ہو گیا۔ "دائی" کا لفظ جو بعد میں بچے کی پیدائش کے وقت زچہ کی مدد کرنے والی کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ دراصل بچے کو دودھ پلانے کے لیے رکھی جانے والی ملازمہ کے لیے تھا۔

اپنے جسم کا دھندا کرنے والی عورتوں کے لیے مستعمل الفاظ میں سے ایک "بیسوا" ہے جو کہ سنسکرت لفظ ویشیا کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ لفظ ایک ایسے لفظ کے مادے سے نکلا ہے جس کا قدیم مفہوم محض آدمی ہے اور "ویشیا" کا مطلب ایک عام عورت ہے جس سے بعد میں یہ مفہوم مراد لیا جانے لگا کہ وہ عورت جو عام لوگوں کے لیے ہو۔ عام زبان میں ناچنے والی عورتوں کو "کنچنی" بھی کہا جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے بتایا ہے کہ بادشاہ اکبر نے کنجر قوم کی عورتوں کو بجائے کنجری کے کنچنی کا نام دیا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ کنچن کا مفہوم سونے کی دھات ہوتا ہے (پتا نہیں کہ لفظ سونے میں ہم بستری کا ابہام تو نہیں تھا) پیشہ کرنے والی عورت کے لیے "کسبی" کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے جو کہ عربی لفظ کسب (کمانے) سے نکلا ہے۔ چنانچہ کسبی وہ عورت ہے جو کمائی کرتی ہے۔ (ظاہر ہے اپنے جسم سے)

اپنے جسم کا دھندا کرنے والی عورت کے لیے عام طور پر طوائف کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کی ابتدا کی کھوج ہمیں عربی لفظ "طواف" تک لے جاتی ہے۔ جس کا

مطلب کسی چیز کے گرد چکر لگانا ہے۔ جو چکر لگاتا ہے اس سے طواف کہتے ہیں اور چکر لگانے والے گروہ کو طائفہ کہنے لگے۔ چنانچہ جگہ جگہ ناچ گانا پیش کرنے والی ٹولی کو بھی طائفہ کہا جانے لگا۔ طائفہ کی جمع طوائف ہے لیکن اسے واحد شکل دے کر پیشہ کرنے والی عورت کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔

طوائفوں کے لیے خریدار لانے والے کو ان کا دلال کہا جاتا ہے۔ جب کہ لفظ دلال کے سیدھے سادے معنی راہ دکھانے والے کہ ہیں۔ اصطلاحاً دلال وہ شخص ہے جو خریدار کی صاحب مال تک اور صاحب مال کی خریدار تک رہنمائی کرے۔ آج کل اس طرح خرید و فروخت کرنے والوں کے درمیان معاملہ کروانے والے کو ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ جب کہ ایجنٹ کا مفہوم ہے ''فاعل'' حقیقت حال یہ ہے کہ تجارتی معاملے میں اصل فاعل یا تو خریدار ہے یا فروخت کنندہ۔ دلال تو محض ایک درمیانی کڑی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پوری اصطلاح ''کمیشن ایجنٹ'' ہے یعنی کمیشن لے کر کام کرنے والا۔

طوائفوں سے دھندا کرنے والی ''نائیکہ'' کہلاتی ہے۔ جب کہ ''نائک'' کا اصل مفہوم ہوتا ہے ''قائد'' یا ''رہنما'' کا۔ جیسے فوج کا سپہ سالار یا پھر سردار۔ اسی بنا پر کسی کہانی یا ڈرامے کے مرکزی کردار کو بھی ''نائک'' کہتے ہیں لیکن اس کی مونث شکل یعنی ''نائکہ'' بجائے ہیروئن ہونے کہ اس عورت کے مخصوص ہو گئی جو دوسری عورتوں سے پیشہ کرواتی ہے۔

دنیا کے سب سے حیرت انگیز کرتب، لفظوں کا سرکس پیش کرتا ہے۔ لفظوں کی ابتدا کہیں سے ہوتی ہے اور اپنے موجودہ مفہوم تک پہنچتے پہنچتے وہ کچھ سے کچھ شکل و معنی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا تھوڑا بہت اندازہ آپ نے پیشوں اور پیشہ وروں کے ناموں کی اس داستان سے کر لیا ہو گا۔

تعصّب کی زبان

بظاہر مہذّب انسان تعصب اور نفرت کے تصور سے کتراتا ہے لیکن ان تصورات کا سایہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ افراد، گروہوں اور نظریات کے درمیان اختلاف گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں اور اُن کے ساتھ ہی تعصب اور نفرت کا رنگ ہلکا اور گہرا ہوتا رہتا ہے۔ دنیا کی زبانوں کے گودام میں ایسے لاتعداد الفاظ بھرے پڑے ہیں جنھوں نے اسی قسم کے تعصبات سے جنم لیا تھا۔ کسی زمانے میں ان الفاظ میں موجودہ نفرت اور ناگواری کے زہر اور تلخی کو نوکِ زبان پر محسوس کیا جاسکتا تھا لیکن اب یہ الفاظ دسترخوانِ زبان و بیان کی رنگا رنگ لذت کا سامان ہیں۔

نسلی برتری کے احساس نے غیر اقوام کو کمتر، غیر مہذب بلکہ عقلی اعتبار سے ناقص قرار دینے کے رجحان کو تقویت دی۔ جس زمانے میں بحیرۂ روم کے شمال میں واقع یونان اور رومہ کے لوگوں نے یہ خود اعتمادی حاصل کرلی تھی کہ وہ علم و تہذیب کی دولت سے مالامال ہیں، اس وقت ان میں اپنے علاوہ دوسری قوموں کو حقیر و کمتر سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے بحیرۂ روم کے جنوب میں خاص طور پر افریقہ میں بسنے والی قوموں کو غیر فصیح، ناقابل فہم زبان بولنے والا اور بڑبڑ کرنے والا سمجھتے ہوئے انھیں بربر قوموں سے موسوم کیا اور رفتہ رفتہ بربریت کے ساتھ بے رحمی، سفاکی، خونریزی کی وہ ساری صفات وابستہ کردی گئیں جن کا تعلق وحشیانہ طرز عمل اور غیر مہذب انداز زندگی سے ہے۔ اپنی زبان کو فصاحت کا سرچشمہ سمجھنے اور دوسروں کو کج مج زبان اور تکلم سے قاصر سمجھنے کا یہی رجحان عربوں میں نظر آتا ہے۔ جنھوں نے ہر غیر عرب کو عجمی یعنی گونگے کا نام دیا۔ اسی نسل برتری کا اثر ہندستانی لفظ ''اناڑی'' میں نظر آتا ہے جو دراصل

"انار یہ" یعنی "غیر آریہ" تھا۔ آریہ لوگ خود کو تہذیب کا ضامن سمجھتے تھے اور دوسری قوموں کو "انار یہ" کہہ کر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انہیں تہذیب چھو کر بھی نہیں گئی ہے اور دھیرے دھیرے "اناڑی" کا یہ لفظ ناتجربہ کار ' بے سلیقہ ' بھدے اور بے شعور کے مترادف ہو گیا۔

جوں جوں شہروں اور بستیوں میں آباد ہونے والوں اور زمین پر ملکیت کا حق رکھنے والوں کو سیاسی ' اقتصادی اور سماجی طاقت حاصل ہوتی گئی۔ ویسے ہی ویسے گانو میں رہنے والوں اور کھیتوں پر کام کرنے والوں کی تہذیبی حیثیت کو کمتر سمجھنے کا میلان بڑھتا گیا۔ تہذیب سماج کے اعلا طبقوں کی میراث بن گئی اور عوام الناس سے تعلق رکھنے والے تہذیبی مظاہر کو گھٹیا اور معیار سے گرا ہوا سمجھا جانے لگا چنانچہ ایسے بیشتر الفاظ جو بد مذاقی ' گھٹیا پن ' چھچھورے پن اور خباثت کو ظاہر کرتے ہیں انھیں طبقات سے لیے گئے۔ اردو میں سوقیانہ پن ' بازاریت ' دہقانیت اور گنوار پن ' حقارت کا اظہار کرنے والے الفاظ اسی طبقاتی نفرت کی جانب نشاندہی کرتے ہیں۔ انگریزی میں اس قسم کے بازاری پن کو لفظ "ولگر" VULGAR سے بتایا جاتا ہے جب کہ جس لاطینی لفظ VULGUS کی یہ ایک شکل ہے اس کے معنی صرف لوگوں کی بھیڑ یا عوام الناس ہوتے ہیں۔ انگریزی لفظ "ولن" اب ہمارے لیے غیر معروف نہیں رہا ہے۔ ناول افسانے اور فلمی کہانیوں میں ایسا فسادی کردار جو جگہ جگہ مرکزی کردار کی راہ میں کانٹے بوتا ہے اور کہانی میں اپنی چالوں ' ہتھکنڈوں سازشوں وغیرہ سے دشواریاں پیدا کرتا ہے ' اُسے "ولن" کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ بھی زمیندارانہ تہذیب کی پیداوار ہے۔ "ولن" کے اصلی معنی صرف گانو کے باشندے کے ہیں لیکن کیونکہ زمین داروں نے اکثر اپنے دیہاتی مزدوروں کو آمادہ شر اور اپنا دشمن سمجھا ' اس لیے رفتہ رفتہ یہ لفظ شیطنت پر مائل کردار کے لیے مخصوص ہو گیا۔

اعلا طبقے کے اس رویّے کے خلاف دوسرے طبقوں میں ردِّ عمل ہونا فطری بات ہے۔ چنانچہ عام لوگوں نے اعلا طبقے کے لوگوں کی جانب اپنی نفرت کے اظہار کے لیے الفاظ وضع کیے۔ انھیں میں سے ایک لفظ "بھدا" ہے۔ جس کا مفہوم بد شکل اور بے سلیقہ ہے لیکن "بھدا" کا لفظ "بھدر" سے نکلا ہے جس کا مفہوم شایستہ اور شستہ ہوتا ہے اور "بھدر لوک" کا لفظ اشراف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں اشراف کے خلاف

جذبات کی بنا پر "بھدر" نے بالکل متضاد مفہوم اختیار کر کے "بھدر" کی شکل لی۔ اسی کسانوں اور مزدوروں کے غصے اور احتجاج نے کئی دوسرے لفظوں کو لغت میں داخل کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں آئر لینڈ کے ایک زمین دار نے اپنی آراضی کے انتظام کے لیے برطانوی فوج کے ایک ریٹائرڈ افسر چارلس کننگھم بائیکاٹ کو ملازم رکھا۔ بائیکاٹ نے کسانوں پر بڑی زیادتیاں کرنا شروع کیں۔ خشک سالی کے باوجود ان سے پورا لگان وصول کرنا چاہا اور نادہند کسانوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا۔ اس کی سختیوں سے تنگ آکر ۱۸۸۰ء کے قریب لوگوں نے متفق ہو کر بائیکاٹ سے مکمل قطع تعلق کر لیا۔ یہاں تک کے اسے کھانے پینے اور دوسری ضرورتوں کو پورا کرنا بھی محال ہو گیا۔ بالآخر وہ تنگ آکر برطانیہ بھاگ گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ عوامی غم و غصہ کے اظہار کے لیے بائیکاٹ کا لفظ لغت میں داخل ہو گیا۔ یہی کچھ لفظ "سبو تاژ" کے ساتھ ہوا۔ اس وقت سبوتاژ سے وہ توڑ پھوڑ مراد لی جاتی ہے جو کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کی جائے۔ فرانسیسی زبان میں "سابو" لکڑی کے جوتے کو کہتے ہیں۔ ایسے غریب کسان جو چمڑے کے جوتے نہیں خرید سکتے وہ سردی میں پیروں کو برف سے بچانے کے لیے لکڑی کو کھوکھلا کر کے جوتے بنا لیتے تھے۔ بعض اوقات جب ان کسانوں کا اپنے زمین داروں سے جھگڑا ہوتا تو وہ اپنے لکڑی کے جوتوں سے فصل کو روند کر اپنا غصہ نکالتے اور اسے "سبوتاژ" کہا جاتا۔ صنعتی دور میں جب کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے اپنی مانگوں کو منوانے کے لیے کارخانے کی مشینوں میں گڑبڑ کر کے کام ٹھپ کر دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا تو "سبوتاژ" کا یہی لفظ استعمال ہونے لگا۔

تعصب کی ایک اور طاقتور بنیاد مذہب رہی ہے۔ آج ہماری لغت میں کئی ایسے الفاظ اپنی جگہ بنا چکے ہیں جنھیں کبھی مذہبی تعصب سے جنم لیا تھا۔ قدیم ہندستان میں ایک وقت ایسا گذرا ہے جب بدھ مذہب کے پیرو اپنے پڑوسیوں کے ناپسندیدگی کا نشانہ بنے۔ جب کہ لفظ "بدھ" سے عقل، سمجھ اور الوہی علم کا مفہوم لیا جاتا ہے "بدھو" جو دراصل بدمذہب کے پیرو کے لیے ایک لفظ ہے، کم عقل ناسمجھ اور بے شعور کے مترادف سمجھا جانے لگا "پاشنڈ" بدھ فرقے کے نہایت پاکباز اور روحانی طاقتوں کے مالک سادھوؤں کا ایک طبقہ ہوا کرتا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بار جب کچھ پاشنڈ شہنشاہ اشوک سے ملنے آئے تو وہ ان کے

استقبال کے لیے دروازے تک گیا تھا لیکن اب "پاکھنڈی" کا لفظ جعلساز فریبی اور دھوکے باز کے مفہوم میں زبان زد خاص و عام ہے۔ پہنچے ہوئے بدھ سادھو "اودھوت" کہلاتے تھے کیونکہ وہ دوران ریاضت عرفانِ حقیقت میں پوری طرح محو ہو جاتے تھے۔ اس سے دوسرے لوگوں نے شراب پی کر مدہوش ہو جانے والوں کو "ڈھت" کہنے کی روش اختیار کی۔ احمق ' بے ڈھنگے اور دنیا سے بے خبر شخص کو بعض اوقات "بجبر بٹو" کہا جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک مہمل لفظ ہے لیکن دراصل یہ "وجر بٹک" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ "وجر بٹک" وہ سادھو کہلاتے تھے جو پکے برہم چاری کی زندگی گذارتے تھے اور خود کو دنیاوی معاملات ' تعلقات اور لذات سے دور رکھتے تھے۔

جین مذہب کے پیرو بھی تعصبات کے نشانے سے نہیں بچ سکے جو شخص بے معنی ادھر اُدھر کی ہانکتا ہے۔ اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ "آئیں بائیں شائیں" کر رہا ہے۔ آئیں بائیں شائیں" بظاہر بے معنی بکواس ہے لیکن یہ پالی زبان کے ایک فقرے "اتی پات شانتی" کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خونریزی سے بچنے میں ہی امن و نجات ہے۔ یہ فقرہ جین مذہب کی تعلیمات میں سے ہے۔ اسی طرح جینیوں کا دگمبر طبقہ دنیا اور مادی تعلقات سے قطعاً بے نیازی کے اظہار کے لیے بے لباس رہنا پسند کرتا ہے اور جسم کو احساس سے بے نیاز کرنے کے لیے اُن کے سادھو اپنے جسم کے بال بھی نوچ نوچ کر اکھاڑ ڈالتے ہیں۔ اسی وجہ سے دوسروں نے انھیں "ننگا لچا" کہنا شروع کر دیا یہاں تک کہ "لچا" کا مطلب ہی بد معاش ' بد کردار اور دغا باز ہونے لگا۔ فرقہ وارانہ کشاکش عجیب عجیب رنگ دکھاتی ہے۔ اگر ایک فرقے کی دل آزاری کے لیے حجام کو خلیفہ کہنے کا رواج ڈالا جاتا ہے تو جواباً غنڈے اور بد معاش کو "شہدہ" کہہ کر شہدائے کربلا کی بے حرمتی سے پاک نہیں ہوتا اور ستم ظریفی یہ ہے کہ عام محاورے میں دونوں ایسے کھپ جاتے ہیں کہ بعد میں یہ احساس نہیں رہتا کہ کبھی ان کے پس پردہ کوئی تعصب یا تلخی بھی کار فرما تھی۔

پڑوسیوں سے چشمک اور ہمسروں سے رقابت ' افراد میں ہی نہیں گروہوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ اہل مشرق کو تو یہ احساس پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ ساتھ رہنا اور ایک دوسرے کی عزت و قدر کرنا نہیں جانتے لیکن دنیا کو تہذیب و تمدن کا معلم ہونے کا دعوا کرنے والے اہل مغرب بھی ان کمزوریوں سے پاک نہیں ہیں۔ اس کی شہادت یوروپ کی

زبانوں میں پڑوسی ملکوں اور قوموں کے بارے میں موجود الفاظ و محاورات سے دستیاب ہوتی ہے۔ انگریز جو اپنے کندھوں پر ہندستان کی، جہالت کو تہذیب کی روشنی سے دور کرنے کی ذمے داری لے کر آیا تھا وہ اسکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ میں رہنے والے اپنے پڑوسیوں کو جس حقارت کے ساتھ سے دیکھتا ہے اور فرانسیسوں اور ڈچوں اور اسپین کے باشندوں کا جس طرح مذاق بناتا ہے اس سے بڑی عبرت ہوتی ہے۔

اسکاٹ لینڈ حکومت برطانیہ کا ایک حصہ ہے لیکن انگریز اسکاٹ لینڈ والوں کی طرز زندگی کا مذاق اُڑانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتا۔ اگر آپ کھجارے ہیں تو آپ اسکاچ فڈل (گویا ستار) بجارہے ہوں گے۔ اسکاچ آشیر واد کا مطلب ہے ڈانٹ پھٹکار۔ اسکاچ کنگھا مویشیوں کا کنگھا کہلاتا ہے۔ بلا چرچ یا کورٹ میں جائے جو شادی کا معاہدہ کیا جائے اسے اسکاچ بیاہ کہتے ہیں۔ جس گلاب میں بہت کانٹے ہوں وہ اسکاچ روز ہے اور ککرمتا۔ اسکاچ بانیٹ (عورتوں کا ہیٹ) ہے۔ اسکاچ ناشتہ وہ ہے جس میں خوب ڈٹ کر کھایا جائے اور خود اسکاٹ لینڈ، کھجلی، خارش اور بالوں کی جوؤں کا دیش ہے۔

آئر لینڈ، انگلینڈ کا قریب ترین پڑوسی ہے لیکن آئر لینڈ پر استعمال کرنے کے لیے انگریزوں کی ترکش میں تیروں کی کمی نہیں۔ پولس اسٹیشن، آئرلیش کلب ہاؤس ہے آئرش رتھ، آدمی کی دو ٹانگیں ہیں۔ پھاوڑا، آئرش چمچہ ہے۔ آئرش گواہی، جھوٹی گواہی ہے۔ آئرش دعوت کا مطلب ہے فاقہ اور آئرش ترقی کا مفہوم ہے تنزل۔

سترھویں صدی میں ہالینڈ ایک بحری طاقت کی شکل میں اُبھرا۔ انگلستان کی اس سلسلے میں ہالینڈ سے رقابت ایک شدید نفرت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ چنانچہ انگریزوں نے ڈچ لوگوں سے منسوب کر کے بہت سارے توہین آمیز محاورے بنائے۔ آپ کو معلوم ہے ڈچ بلبل کیا ہوتی ہے۔ انگریزوں نے یہ خطاب مینڈک کو دیا ہے۔ اسی طرح ڈچ بیوہ، طوائف کا نام ہے جب کہ ڈچ بیوی سے مراد وہ سہارا ہے جس پر آپ اپنا ہاتھ ٹیک کر آرام کر سکیں۔ ڈچ ہمت وہ ہے جو شراب کے نشہ میں ظاہر کی جائے۔ ڈچ کنسرٹ وہ ہنگامہ ہے جو شرابیوں کے ایک ساتھ شور مچانے سے پیدا ہو۔ ڈچ سودا نشے کی حالت میں کیا جاتا ہے اور ہوش میں آنے کے بعد اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ڈچ نیلام میں بولی بڑھتی نہیں گھٹتی ہے۔ ڈچ ضیافت میں ہر شخص اپنا بل خود ادا کرتا ہے۔ ڈچ چچا وہ ہے جو خود ڈانٹ

ڈپٹ کرے اور ڈچ آرام یہ ہے کہ کوئی آرام نہ ہو۔ پیدل چلنے کو ڈچ سواری کہا گیا۔ موٹے اور بھدے جسم والے کو ڈچ کاٹھی کا بتایا گیا اور ایک ایک چیز کے حساب کی جگہ ایک ساتھ یک مشت رقم دینے کو ڈچ حساب کہا گیا۔ اس طرح ڈچ لوگوں کو شرابی جھگڑالو، بے اعتبار، بدمذاق، بداخلاق اور احمق ظاہر کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان بھی پرانی رقابت ہے۔ انگریز فرانسیسیوں کو بے فکر، شرابی اور جنسی بے راہ روی کا شکار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فرنچ رخصت کا مطلب وہ چھٹی ہے جو بغیر اجازت کے منائی جائے اور فرنچ کریم سے مراد برانڈی ہوتی ہے، پھر جہاں جنسی معاملات اور عیاشی کا ذکر ہو انگریز فرانسیسیوں کو گھسیٹ لاتے ہیں۔ چنانچہ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ میری "فرانسیسی معاف کیجیے گا" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میری باتوں میں جنسی معاملات کے ذکر یا جنسی گالیوں کو معاف کیجیے گا۔ انگریزوں کی بول چال کی زبان میں جنسی افعال سے متعلق کئی اصطلاحات میں فرانسیسیوں کا تعاون حاصل کیا گیا ہے۔ جیسے فرانسیسی بوسہ وہ ہے جس میں لبوں کے ساتھ زبان سے بھی کام لیا جائے فرانسیسی لفافہ (لیٹر) "نرودھ" کو کہا جاتا ہے۔ فرانسیسی چیچک، فرانسیسی گٹھیا، فرانسیسی بیماری یا فرانسیسی چیز سے آتشک (سفلس) کی اذیت ناک جنسی بیماری مراد لی جاتی ہے۔ فرانسیسی پرنٹ کا اشارہ عریاں گندی تصاویر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

فرانسیسی بھی انگریزوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ وہ من مانی چھٹی منانے کو انگریز چھٹی منانا کہتے ہیں اور "نرودھ" کو انگریز ٹوپی کا نام دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں فرانسیسی لوگ نادہند قرض دار کو انگریز کہا کرتے تھے۔ سر کے بالوں میں پڑنے والی جوؤں کو فرانسیسی "اسپینی" کہتے ہیں اور پسوؤں کو "مادہ اسپینی" کا نام دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جرمن لوگ جوں کے لیے "فرانسیسی" اور تل چٹے (کاک روچ) کے لیے "روسی" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

ہندستان میں آریوں کے غلبے کے بعد جن باہر سے آنے والی قوموں سے مزاحمت کرنا پڑی اُن میں شدید ترین مقابلہ یونانیوں سے ہوا چنانچہ بعد میں سنسکرت میں غیر ہندستانیوں کے لیے حقارتاً "یون" کا لفظ استعمال ہونے لگا یہاں تک کہ آگے چل کر اس لفظ کا اطلاق مسلمانوں پر ہوا۔ شروع میں ایک عرصے تک تُرک حاکم رہے چنانچہ لوگ

ادب میں "ترک" کے لفظ کے ساتھ ایک خاص تیکھاپن پیدا ہو گیا اور "ترکی" سے اکڑ، شیخی، دباؤ اور دبدبہ مراد لیا جانے لگا۔ ترکی تمام ہونا اور ترکی بہ ترکی جواب دینا وغیرہ محاوروں میں یہی مفہوم ابھر کر آیا۔

جب ہندستان میں دھیرے دھیرے یوروپی لوگوں نے اپنے قدم جمانا شروع کیا تو ان کے خلاف بھی نفرت کا جذبہ اُبھرنے لگا اور ان کو حقارتاً "فرنگی" کے نام سے پکارا گیا۔ بنیادی طور پر "فرنگی" لفظ کا تعلق فرانس کے باشندوں سے تھا۔ صلیبی جنگوں کے دوران فرانسیسی قیادت میں یوروپ کے لوگوں نے بیت المقدس پر چڑھائی کی تھی۔ اس بنا پر مسلمان یوروپ کے لوگوں کو "اصحاب فرنج" سے تعبیر کرنے لگے اور "اصحاب فرنج" اور فرنگی کے فقروں کے ساتھ ایک ناپسندیدگی کا جذبہ وابستہ ہو گیا۔ ہندستان میں پہلے "فرنگی" کا لفظ پرتگالی ڈاکوؤں کے لیے استعمال ہوا۔ بعد میں جب انگریزوں نے اس ملک پر تسلط کیا تو انھیں فرنگی کہا گیا، کیونکہ یہ یوروپ کے لوگ عیسائی تھے اس لیے بعض اوقات فرنگی سے مسیحی لوگ بھی مراد لیے جانے لگے۔

بعض دوسرے ممالک کے لوگوں کی ہندستان میں اجنبیت نے بھی گُل کھلائے۔ اُزبک لوگ غالبًا آسانی سے ہندستانی ماحول میں گھل نہیں پائے اور یہاں پہنچنے والے ایسے اکادکا افراد ہندستانیوں کو سراسیمہ اور حواس باختہ جیسے محسوس ہوئے چنانچہ لفظ "اجبک" ہونق اور ہکابکا کے مترادف ہو گیا۔ اسی طرح وسط ایشیا کے خانہ بدوش قازق، قزاق کی شکل میں ڈاکو اور لٹیرے کے ہم معنی بن گئے۔

آپ دیکھیں گے کہ ہندستان کے مختلف فرقوں کے ساتھ بھی بعض ایسی خصوصیات وابستہ ہو گئیں جو کسی ناگوار پہلو کی یاد دلاتی ہیں۔ جٹ قدیم ہندستان میں سندھ کے گردنواح میں آباد ایک قبیلہ تھا جو عام معیار کے مطابق غیر متمدن اور جنگجو تھا اور یہ صفات اس کی جہالت پر محمول کرتے ہوئے "جاہل جٹ" کا محاورہ وضع کیا گیا۔ "جاٹ" اور "جٹا" کے ساتھ ابھی بھی اکھڑپن کا مفہوم جوڑا جاتا ہے۔ کنجر چمار وغیرہ ذاتوں کے نام بھی بطور گالی کے استعمال ہوتے رہے۔

شیخ صاحب کی اکڑفوں نے "شیخی" کو جنم دیا۔ پٹھانوں کے ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے کو "پٹھانی" کہا گیا۔ لالا لوگوں کی چالاکی 'پانڈوں کے کھانے پینے

میں لالچ اور بینوں کی کنجوسی ضرب المثل ہے۔

اسی طرح علاقائی نسبت کے ذریعے حقارت کے جذبے کا اظہار کیا گیا۔ ماڑواڑیوں کا نام لین دین اور قرض سود کی بُرائیوں کے ساتھ جڑ گیا۔ بنگال اور بہار میں قحط کی آفتوں نے ''بھوکے بنگالی'' کے فقرے کو جنم دیا۔ ''بابو'' کا لفظ تعظیم و تکریم کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن جب یہی لفظ انگریزوں نے اپنے کارندوں کے لیے استعمال کیا تو ''بنگالی بابو'' انگریزوں کے پٹھوؤں اور کلرکوں سے متعلق ہو گیا۔ بنارس کے شہر میں روحانی تسکین اور نجات کے متلاشی سادہ لوح عقیدت مندوں کے ٹھگنے والوں کی وجہ سے ''بنارسی ٹھگ'' مشہور ہو گئے۔ شکارپور وغیرہ کے سیدھے سادے باشندے کے ذریعے احمق اور بدھو کی مثال دی جانے لگی۔ واجد علی شاہ وغیرہ کے زمانے میں لکھنؤ کے عیش و عشرت کے افسانوں نے لکھنوی تہذیب کو بے جا نزاکت اور نسوانیت کا نمائندہ سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ چنانچہ ''گومتی کا پانی پینے'' کا محاورہ استعمال کر کے مزاج میں نسوانیت کی جانب اشارہ کیا جانے لگا۔ شاہجہاں پور کے پٹھانوں کی وجہ سے ''شاہجہاں پوری بغل میں چھری'' جیسی کہاوتیں بن گئیں۔

یہ عام انسان کی نفسیات ہے کہ اُسے ہر ایسے شخص سے کد ہو جاتی ہے جو اس پر کوئی پابندی لگائے۔ چنانچہ قاضی محتسب، کوتوال، واعظ، ناصح، استاد اور سخت گیر بزرگ سب اس بیر کا شکار ہوتے ہیں۔ شعر و ادب میں تو انھیں طنز کا نشانہ تو بنایا ہی گیا ہے، الفاظ اور محاوروں میں بھی اس نفسیات کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ مثلاً ریش قاضی وہ صافی کہلاتی ہے جس میں شراب چھانی جاتی ہے۔ عالم اور علامہ مرد ہیں تو ٹھیک ہے لیکن عورت علامہ ہوئی تو اسے زیادہ خطرناک اور فتنہ پرداز کون ہوگا۔ استاد اور گرو اپنی جگہ قابل احترام ہیں لیکن استادوں کے استاد اور گرو گھنٹال سے لوگ ڈر تو سکتے ہیں لیکن ان کی عزت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

لفظوں، محاوروں اور کہاوتوں کی دنیا میں اس طرح جا بجا تعصب کی کار فرمائی نظر آتی ہے لیکن وقت کی خراد پر ہمارے افراد کی نفرتیں اتنی آسانی سے چھیلی نا جا سکیں، الفاظ میں ٹھونکی گئی کد و کینہ، نفرت و رقابت، تمسخر اور حقارت کی میخیں بہت جلد ہموار ہو جاتی ہیں اور ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ وہ فریق بھی جس کی توہین یا دل آزاری کے لیے شروع میں ان الفاظ و اشارات کو وضع کیا گیا تھا وہ بھی انھیں بلا تامل استعمال کرتا دکھائی دیتا ہے

لفظوں کی انوکھی دنیا

لفظوں کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ اس زندگی کے نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ اُن میں اپنی قسم کی ڈرامائیت اور ان کا اپنا رومان ہوتا ہے۔ وہ الفاظ جو اوپر سے روکھے پھیکے، کھوکھلے اور رسمی معلوم ہوتے ہیں ان میں سے بعض کے پیچھے حیرت انگیز کہانیاں، رسم و رواج اور تاریخی حقیقتیں چھپی ہوتی ہیں۔ ان پس پردہ حقیقتوں کی تلاش اور ان کے بارے میں علم سے ہم کو ایک الگ ہی قسم کا لطف آتا ہے، کچھ ایسا ہی جیسے روزنِ در میں آنکھ لگا کر چوری چھپے کے نظارے میں آتا ہے۔ آیئے لغت کی دفتی میں بڑی درازوں میں آنکھ لگا کر دیکھیں کہ کس لفظ کے آنگن میں کیا ڈراما چل رہا ہے۔

اب سائرن کے لفظ کو ہی لیجیے۔ یہ خشک، غیر شاعرانہ سا نام جس کے بھدے پن کو ہم بعض اوقات "بھونپو" کہہ کر ظاہر کرتے ہیں آج کی صنعتی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کی بھاگم بھاگ اور بھیڑ والی مشینی زندگی کا ایک حصہ وہ فیکٹریاں ہیں جن کی دھواں اُگلتی چمنیاں اور ان شہروں کی افقی شناخت بن چکی ہیں۔ انھیں فیکٹریوں سے سائرن کی وہ آوازیں سننے کو ملتی ہیں جن کے ساتھ فیکٹریوں کی آہنی پھاٹک تھکے ہوئے انسانوں کی ایک بھیڑ کو اُگل دیتے ہیں اور مزدوروں کی دوسری بھیڑ کو اپنے اندر بند کر لیتے ہیں لیکن اس غیر شاعرانہ منظر کو حرکت بخشنے والے لفظ "سائرن" کو صدیوں پہلے شاعرانہ تخیل نے جنم دیا تھا۔ قدیم یونانی شاعروں نے "سائرن" کا ایک عجیب پر اسرار مخلوق کی شکل میں تصور کیا تھا۔ ایک ایسی مخلوق کی شکل میں جس کا چہرہ، زلفیں، گردن اور سینہ حسین عورتوں جیسا اور باقی جسم پرندوں کی طرح ہوتا تھا۔ جب سائرنس گاتیں تو آس پاس کی دنیا ان کے شیریں نغمے میں محو ہو جاتی، لوگ بے قابو ہو جاتے، سمندروں میں چلتے جہاز رک جاتے۔ ملاح سمندر میں کود کر سائرنس کے جزیروں کی طرف مجنونانہ انداز سے تیرنے لگتے اور کنارے پر پہنچ کر چٹانوں پر بیٹھ کر سائرنس کے نغمے سنتے رہتے۔ ان کو

تن بدن کا، کھانے پینے کا ہوش نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ وہ وہیں چٹانوں پر بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیتے۔ اس جزیرے سے کوئی زندہ لوٹ کر نہیں آتا لیکن ایک بار انہونی ہوئی۔ جب یونانی ارگوناٹس کا جہاز بحیرۂ روم میں سائرنس کے جزیرے کے پاس سے گزرا تو ان کے ساتھ دیوتاؤں کا چہیتا موسیقار آرفیس بھی تھا۔ آرفیس کے کان میں جیسے ہی سائرنس کی آواز پڑی تو اس نے اپنا رباب اٹھایا اور اپنا بہترین نغمہ اپنے سروں میں چھیڑا۔ سائرنس کی آواز دب گئی۔ صرف ایک ایسا بد قسمت ملاح تھا جس پر ان کا جادو چل گیا۔ وہ بے قابو ہو کر سمندر میں کود پڑا اور پھر واپس نہ آیا لیکن سائرنس کو سب سے زیادہ مایوسی اس وقت ہوئی جب یونانی ہیرو اوڈے سیس ان کے جزیرے کے پاس سے گزرا۔ اوڈے سیس نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں اور ملاحوں کے کانوں میں موم بھروا دیا تھا۔ لیکن خود اسے یہ اشتیاق تھا کہ وہ یہ سنے کہ سائرنس کیا گاتی ہیں۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ خود اس کو رسیوں سے مستول کے ساتھ کس کر باندھ دیا جائے۔ اس نے سنا کہ وہ گا رہی ہیں کہ وہ کیا ہے جو انسان کو دائمی سکون دے سکتا ہے اور لافانی خوشی بخش سکتا ہے۔ وہ کیا ہے جسے لافانی حسن کا نظارہ ہو سکتا ہے وہ کیا ہے جو موت کے تصور سے نجات دلا سکتا ہے۔ ان سب کا راز ان کے پاس ہے، ان کے ان نغموں میں ہے جو وہ سنانے والی ہیں۔ ان نغموں میں وہ مٹھاس ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ وہ لطف ہے جو کبھی کم نہ ہوگا۔ وہ مسرت ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔ ان نغموں کو سن کر اوڈے سیس بیتابانہ خود کو رسیوں سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کرتا رہا۔ اس کا جسم لہولہان ہو گیا۔ اس کی فوق الانسانی طاقت جواب دے گئی۔ سائرنس کی آواز کی طلسمی کشش نے اس کے فولادی ارادے کو موم سے بھی زیادہ نرم کر دیا۔ بہر حال اس کی دانشمندی کی وجہ سے اس پر اور اس کے ساتھیوں پر سائرنس کا جادو نہ چل سکا اور وہ سب صحیح سلامت ان کے نغموں کی زد سے باہر نکل گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اوڈے سیس کے اس طرح بچ کر نکل جانے سے سائرنس کو شدید جھنجھلاہٹ ہوئی اور انھوں نے غصے میں آکر سمندر میں کود کر جان دے دی۔ اس طرح سائرنس کو اس کے ہی خالق یونانی شاعروں نے مار ڈالا لیکن انیسویں صدی میں ایک فرانسیسی موسیقار نے انھیں پھر سے زندہ کیا اور اسی کے فیض سے سائرنس سے ہم آج بھی واقف ہیں۔ ۱۸۱۹ء میں "کانیار دیلا تور" نامی اس موسیقار نے موسیقی کے سر پیدا کرنے اور ان کے ارتعاش کی پیمائش کے لیے ایک آلہ بنایا

اس کا نام اس نے سائرن رکھا۔ ظاہر ہے یہ قدیم یونانی شاعروں کے تخیل کو اس کا خراج عقیدت تھا لیکن دور حاضر نے انسان کی رومانی تخیل کو بار بار صدمہ پہنچایا ہے اور یہی عمل اس نے سائرن کے لفظ کے ساتھ کیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک جگہ جگہ فیکٹریاں قائم ہو گئیں اور ان میں یکساں بھرائی ہوئی آواز میں اطلاع دینے والی سیٹیوں کا رواج عام ہوا تو اس کے لیے کسی لفظ کی ضرورت ہوئی اور دیلا تور کے آلے کی مناسبت سے اسے سائرن کہنے لگے۔ سوچیے کہاں وہ دائمی مسرت کی بشارت سنانے والی سائرنس کے نغمے اور کہاں فیکٹری کے بھونپو کی سامعہ خراش ناگوار آواز۔

آیئے ایک اور لفظ ''پمفلٹ'' کے اتار چڑھاؤ دیکھیں۔ یہ بھی ایک ایسا لفظ ہے جس کی دلچسپی کو ہماری موجودہ میکانکی زندگی سے سوختت کر لیا ہے۔ آج پمفلٹ کسی روکھے سوکھے موضوع پر نظریاتی بحث کرنے والا پروپیگنڈے کی غرض سے چھاپا گیا کتابچہ ہے اور ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ سات آٹھ صدی قبل پمفلٹ کے نام سے لوگوں کے منہ سے کس قسم کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ بارھویں صدی میں اٹلی میں پمفلٹ نے ایک نہایت چٹ پٹی کہانی والی نظم کی حیثیت سے جنم لیا تھا۔ اس کہانی کا ہیرو ایک بوڑھا ہوتا تھا جس کو پیم فیلس کا نام دیا گیا۔ پیم فیلس کے لفظی معنی ہر ایک کے شیدائی یا دل پھینک ہوتے ہیں۔ یہ نظم ایک ایسے دل پھینک بوڑھے کی رنگ رلیوں کی کہانی تھی جو اپنی مطلب بر آری کے لیے طرح طرح کے حیلے کرتا ہے اور انتہائی معزز اور باعفت خواتین کو ساری چوکیداری اور پہروں کے باوجود جُل دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ بدمعاشیوں کی کہانی لوگوں میں بیحد مقبول تھی اور اسے لوگ چھپا چھپا کر پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ اٹلی کی خانقاہوں میں راہب بھی اسے اپنے چغوں میں چھپا کر لے جاتے اور تکیوں میں چھپا کر رکھتے، کیونکہ اس وقت تک چھاپے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس لیے گنی چنی ہاتھ سے لکھی ہوئی نقلیں ہی لوگوں میں گردش کرتیں۔ اس غرض سے کہ انھیں چھپا کر رکھنے میں آسانی ہو، یہ نقلیں چھوٹے سائز کے کاغذ پر کی جاتیں۔ چھاپے کی ایجاد کے بعد تو اس قسم کے قصوں کہانیوں کی نقلوں کو آسانی کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا جانے لگا لیکن پمفلٹ کا لفظ زندہ رہا اور چھوٹے سائز کی کسی بھی کتاب کو پمفلٹ کہنے لگے۔

اب آیئے ان جوبلی منانے والوں سے پوچھیں کہ یہ جوبلی کیوں مناتے ہیں۔ پہلے تو

صرف پچاس سالہ ہی جوبلی منائی جاتی تھی لیکن اب تو صرف پچیس سالہ پچاس سالہ، ساٹھ سالہ، پچھتر سالہ جوبلیاں ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی منائی جانے لگی ہیں۔ دراصل جوبلی یہودیوں کا ایک تہوار ہے جسے وہ پچاس سال میں ایک بار مصر سے اپنے اخراج کی یاد میں منایا کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں عہد نامہ عتیق (اولڈ ٹیسٹامنٹ) کی دوسری کتاب میں واضح طور پر احکامات موجود ہیں۔ یہ موقع پوری چھٹی کا موقع ہوتا ہے۔ زمین کو دو سال کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ زمین کو آرام ملے۔ کھیتوں کو جوتا نہیں جاتا۔ باغوں کے پودوں کی چھٹائی نہیں کی جاتی۔ پھل دار درختوں کے پھل نہیں چنے جاتے زمین سے اپنے آپ نکلنے والے پھلوں کو غریبوں، غلاموں، اجنبیوں اور مویشی کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لوگ مچھلی پکڑ کر شکار کر کے شہد کی مکھیوں سے حاصل کیے ہوئے شہد اور مویشیوں سے حاصل کیے دودھ دہی وغیرہ پر اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ زمینوں کے ان کے اصل مالکوں کو لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر لوگ بگل اور مینڈھے کے سینگوں سے بنے ہارن بجا بجا کر خوشیاں مناتے ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ کہ وہ لفظ جس سے جوبلی نکلا ہے اس کا مطلب ہی مینڈھے کا سینگ ہوتا ہے۔

عیسائیوں نے جوبلی کا لفظ تقریب کے معنی میں اختیار کیا اور کسی واقعے کی پچاسویں سالگرہ کو جوبلی کی حیثیت سے منایا جانے لگا مثلاً شادی یا تخت نشینی کی اس قسم کی سالگرہ کو گولڈن جوبلی کا نام دیا گیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے ۱۸۹۷ء میں اپنی تخت نشینی کی ساٹھویں سالگرہ ڈائمنڈ جوبلی کے طور پر منائی اور اس کے بعد ڈائمنڈ جوبلی کا فیشن ہو گیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے پوتے جارج پنجم نے پچیسویں سال سلور جوبلی منانے کا رواج ڈالا۔ اب تو جوبلیاں کسی وقت منائی جانے لگیں۔ اور ان کا نام پنساری کی دوکان کی ہر شے پر پڑ گیا ہے۔ جیسے پہلی سالگرہ کو کاغذ جوبلی، دوسری کو روئی جوبلی، تیسری کو چمڑا جوبلی، چوتھی کو پھل جوبلی اور پانچویں کو لکڑی جوبلی کہنے لگے ہیں۔ ساتویں جوبلی تانبے، آٹھویں جوبلی کانسے، نویں چینی کے سامان دسویں ایلومنیم، تیسویں موتی، چالیسویں لعل اور پچھترویں پلاٹینم سے منسلک کر دی گئی ہیں۔

جوبلی کا تو سینگ سے تعلق ہے لیکن کیا کبھی آپ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ شاد اور بادشاہ کا بھی سینگ سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس زمانے میں انسان

جنگلوں میں گزر بسر کرتا تھا، اس وقت وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جنگلی جانوروں کو مارا کرتا تھا لیکن سینگ والے جانوروں کو مارنے کے لیے اسے بڑی ہوشیاری اور پھرتی کی ضرورت ہوتی تھی، چنانچہ جب وہ شکار کر لیتا تو جانور کے سینگ اپنے سر پر لگا کر خوشیاں مناتا تھا۔ آج بھی مدھیہ پردیش کے بستر کے علاقے میں رہنے والے قبائلی لوگوں میں سر پر سینگ پہن کر ناچنے کا رواج ہے۔ قدیم ایران میں یہ رواج تھا کہ سردار سر پر سینگ پہنا کرتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعد میں تاج پہننے کا رواج بھی اسی قسم کی کسی رسم سے پڑا ہو۔ فارسی میں سینگ کو شاخ کہتے ہیں چنانچہ شاخ پہن کر بیٹھنے والے سردار کو بھی شاخ کہنے لگے جس نے دھیرے دھیرے "شاہ" کی شکل اختیار کر لی۔

شاخ سے شاخانہ یاد آتا ہے۔ کسی ایسے مسئلے کو جو کسی قسم کے فتنے و فساد کا سبب بنے اسے بعض اوقات شاخسانہ کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ بھی سینگ کی ہی کارستانی ہے۔ کیسے ؟۔ شاخسانہ دراصل شاخ شانہ تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایران میں ایک قسم کے اڑیل فقیر ایسے بھی ہوتے تھے جو چاہے کچھ ہو جائے، کچھ نہ کچھ لے کر ٹلتے تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بکری کا سینگ اور بکری کے شانے کی ہڈی کا ٹکڑا رکھتے تھے اور انھیں رگڑ رگڑ کر ایسی مکروہ آواز پیدا کرتے تھے کہ لوگ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے انھیں جلدی سے کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کر دیا کرتے تھے لیکن اگر کوئی شخص اتنی آسانی سے انھیں پیسا دینے پر راضی نہ ہوتا تو یہ لوگ اس نکیلے سینگ سے خود اپنے جسم کو لہولہان کر لیتے اور خوب شور غل مچاتے یہاں تک کہ سامنے والا مجبور ہو کر انھیں کچھ نہ کچھ دے کر ٹالتا۔ اسی بنا پر جب کوئی شخص کسی طرح کی حجت کر کے کوئی فتنہ کھڑا کرتا ہے تو اسے بھی شاخسانہ کہنے لگے۔

دھرنے کا لفظ جو آج کل کی سیاسی کارگزاریوں کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ اس کے پیچھے کچھ اسی قسم کی اصلیت ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اپنی مانگیں منوانے کے لیے دھرنے پر بیٹھنا جدوجہد آزادی کے دوران مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے حربوں کے طور پر مقبول ہوا لیکن حقیقت یہ ہے یہ طریقہ ہندستان میں بہت زمانے سے رائج ہے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مظلوم کی ہائے، ظالم کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اگر مظلوم ظالم کے دروازے پر بیٹھ کر اپنے آپ کو بھوکا رکھ کر اپنے آپ کو ایذا پہنچا کر، اپنے اعضا کو کاٹ کر یا مجروح کر کے تکلیف پہنچائے گا تو اتنی ہی تکلیفیں ظالم کو پہنچیں گی۔ اس کوشش میں اگر

مظلوم کی جان چلی جائے تو مظلوم کی روح بھوت بن کر ظالم کی زندگی کو عذاب بنادے گی۔ اس حربے کا اتنا رواج تھا کہ کبھی کبھی قرض دینے والے نادہند قرض داروں کے گھر کے سامنے دھرنے پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ فقیروں کے کچھ گروپوں نے بھی پیسے وصول کرنے کے لیے یہ طریقہ اپنا رکھا تھا۔ ان کے طریقوں کے لحاظ سے ان کے الگ الگ نام تھے۔ ڈوری والے گلے میں ڈوری کس کر پھانسی کی دھمکی دیتے تھے۔ ڈنڈی والے ڈنڈیاں بجا بجا کر دن دن بھر کوستے رہتے تھے۔ اڑی مار دکان کے سامنے اڑ کر کھڑے ہو جاتے اور دن دن بھر کھڑے رہتے۔ دھرنے پر بیٹھنا راجستھان اور گجرات میں بہت عام تھا۔ گاندھی جی نے یقیناً اپنے وطن گجرات میں یہ سب کچھ دیکھا ہو گا۔ انھوں اس طریقے کو جس سے عام لوگ اچھی طرح واقف تھے بڑی خوبی کے ساتھ عدم تشدد کے اصول کو اپناتے ہوئے اپنے سیاسی نقطہ نظر کو ایک طاقتور حکومت پر واضح کرنے کے لیے استعمال کیا۔

لفظوں کی اپنی دنیا ہے۔ اُن کی آپ بیتی میں حیرت انگیز موڑ ہیں، عجیب عجیب اسرار ہیں، انوکھا رومان ہے۔ ان کی زندگی میں تو جھانک کر دیکھیے ان کی داستان، انسانی زندگی کی داستان سے کچھ کم دلچسپ نہیں۔

پیمانوں کی کہانی

انسان حیوان سے مختلف ہے۔ یہ سب ہی جانتے ہیں اور انسان کی بات کرنے ، سوچنے اور محسوس کرنے کی ان صلاحیتوں کی اکثر بات کرتے ہیں جو انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہیں لیکن ایک اور خصوصیت بھی ہے جو قدرت نے انسان میں پیدا کی ہے اور حیوان میں نہیں۔ یہ وہ شعور ہے جس کی بنیاد پر انسان ناپ تول کا فرق کر سکتا ہے۔ بچے کو جیسے ہی سمجھ آتی ہے وہ کم اور زیادہ کے فرق کو سمجھنے لگتا ہے اور جیسے جیسے اس کے شعور میں پختگی اور وسعت آتی جاتی ہے۔ ویسے ہی ویسے وہ ناپ تول کا باریک سے باریک فرق کرنے لگتا ہے۔

یہ شعور اندازے سے شروع ہوتا ہے۔ لفظ "پیمانے" میں بھی اندازہ کرنے کے معنی موجود ہیں اور ناپ تول کا یہ سارا کاروبار بھی دراصل اندازے سے ہی شروع ہوا تھا جیسے مٹھی بھر چاول ، کٹوری بھر دال ، چٹکی بھر نمک سے یہ بات چلی تھی۔ ابتدا میں انسان نے اپنے آس پاس موجود ، بنے بنائے سانچوں کو اپنے ناپ تول کی بنیاد بنایا ، جیسے اس نے لمبائی اور قدم کے فاصلے کو اپنا معیار بنایا۔ پھر ان کی مدد سے کم از کم ناپ سے زیادہ سے زیادہ دوری کے ناپ کے لیے مختلف درجے مقرر کیے۔

ہندستان میں چوڑائی کا سب سے چھوٹا پیمانہ انگل یعنی انگلی کی چوڑائی مقرر کیا گیا۔ بارہ انگل کا ایک بالشت مانا گیا۔ بالشت سے وہ چوڑائی مراد لی گئی جو ہاتھ کا پنجہ پھیلانے پر چھوٹی انگلی کے سرے سے انگوٹھے کے سرے کے درمیان ہوتی ہے۔ "ہندی شبدساگر" نے بالشت کو فارسی لفظ مانا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی میں بالشت یا بالش سے تکیہ مراد لیا جاتا ہے۔ پنجے کی چوڑائی کے لیے سنسکرت میں वितस्ति (وتس تی) کا لفظ آتا ہے۔ غالباً اسی نے میں بالشت کی شکل اختیار کی۔ دو بالشت کا ایک ہاتھ مانا جاتا تھا اور دو ہاتھ کا ایک گز۔ گز

لکڑی کی چھڑی یا لوہے کی چھڑ کو کہتے ہیں۔ جس زمانے میں کارتوسوں کا رواج نہیں تھا اور بندوق کی نال میں بارود کی گولی وغیرہ بھر کر ڈاٹ لگائی جاتی تھی ' اس گولی بارود وغیرہ کو ایک لوہے کی چھڑ سے کوٹ کوٹ کر اندر بٹھایا جاتا تھا۔ یہ چھڑ گز کہلاتی تھی۔ اسی طرح سارنگی وغیرہ سازوں کو بجانے والی کمان کو بھی گز کہتے ہیں۔ تیر کی وہ سیدھی لکڑی جس میں نوک اور پر لگا کر تیر بنایا جاتا ہے گز کہلاتی ہے۔ کپڑا وغیرہ ناپنے کے لیے عام طور پر لوہے کا گز استعمال کیا جاتا ہے جس پر نشان بنے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر نشان ایک گرہ کہلاتا تھا۔ گرہ رسّی دھاگے وغیرہ میں لگائی جانے والی گٹھان کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گز کی غیر موجودگی میں 'گز بھر لمبائی کی رسّی کو بھی ناپنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اسے سولہ برابر حصوں میں بانٹنے کے لیے بیچ بیچ میں گرہیں لگادی جاتی تھیں۔ بعد میں لوہے کے گز میں بھی سولھویں حصوں کو گرہ ہی کہا گیا۔

زیادہ لمبے فاصلے کے لیے کوس کا پیمانہ استعمال کیا جاتا تھا۔ مرتب "فرہنگِ آصفیہ" کا خیال ہے کہ یہ لفظ "گوش" تھا اور "گوشبد" یعنی گائے کی آواز کو ظاہر کرتا تھا لیکن دراصل کوس سنسکرت لفظ "کروش" کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کے معنی چیخ یا پکار کے ہوتے ہیں (فارسی لفظ "خروش" سے مقابلہ کیجیے) اور یہ لفظ "کروش" سنسکرت میں فاصلے کے پیمانے کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا اور غالباً "کروش" کی ہی بنا پر فارسی میں کوس کے لیے لفظ "کروہ" اختیار کیا گیا۔ ظاہر ہے۔ "کروش" سے ابتداءً وہ فاصلہ مراد تھا جہاں تک کسی انسان کی پکار سنی جاسکے۔ ایک انگریز کو جسے سری لنکا میں کام کرنے کا موقع ملا تھا یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اس علاقے میں جنگلوں وغیرہ میں فاصلے کو دیکھ کر نہیں بلکہ سن کر متعین کیا جاتا تھا۔ سری لنکا میں چوتھائی میل کے لگ بھگ فاصلے کو کتّے کی آواز کا فاصلہ بتایا جاتا۔ اس زیادہ فاصلے کو مرغ کی بانگ اور اس سے بھی زیادہ فاصلے کو "ہو" کی آواز جو کہ انسانی آواز کی نقل تھی کے ذریعے بتایا جاتا تھا۔ سڑکوں پر فاصلے کے نشان لگانے کا کام اکبر کے زمانے میں کیا گیا اور "آئین اکبری" میں ایک کوس کو پانچ ہزار گز کے برابر بتایا گیا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں دہلی کے قریب قائم کوس میناروں کے درمیان اوسطاً فاصلہ دو میل سے زیادہ ناپا گیا اور اس طرح موٹے طور پر ایک کوس کو دو میل کے برابر قرار دیا گیا۔

انگریزوں کے عہد میں ہمارے یہاں برطانوی پیمائش کے نظام کو اختیار کیا گیا۔ اس

نظام کی بنیاد فٹ یعنی پیر تھا۔ اس کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کو انچ کہا گیا۔ لفظ "انچ" کا مطلب ہی بارھواں حصہ ہوتا تھا۔ تین فٹ کو ایک "یارڈ" یعنی چھڑی کہا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ انگلستان میں یارڈ کا ناپ بادشاہ ہنری اول کے ہاتھ کے ناپ کے برابر رکھا گیا تھا۔ ہندستان میں گز کی پیمایش ہی تین فٹ مقرر کر دی گئی۔ زیادہ لمبے فاصلے کو فرلانگ اور میل کے ذریعے ظاہر کیا جانے لگا۔ فرلانگ سے وہ لمبائی مراد تھی جو دس ایکڑ رقبے کے مربع کھیت میں ایک سیدھ میں ایک بار میں کی گئی جُتائی سے بنی نالی کی ہو۔ فرلانگ کو میل کا آٹھواں حصہ مانا گیا جس سے ایک فرلانگ میں ۲۲۰ گز ہوئے۔ جہاں تک میل کا سوال ہے یہ ایک ایسے لاطینی لفظ سے بنا ہے جس کا مطلب ہزار ہوتا ہے۔ قدیم روم میں ایک میل سے ایک ہزار دوہرے قدم کا فاصلہ مراد لیا جاتا تھا جو کہ موجودہ پیمایش کے اعتبار سے ۱۴۸۰ میٹر کے برابر تھا اور دہرا قدم پانچ فٹ سے کچھ زائد ہوتا تھا۔ رومن شہنشاہ آگسٹس سیزر نے روم کے چوک میں پہلا میل کا پتھر نصب کروایا تھا جس سے دوسرے مقامات کے فاصلے ناپے جاتے تھے۔ بعد میں مختلف مقامات پر میلوں کی پیمایش مختلف ہوگئی۔ انگلستان میں ملکہ الزبتھ اول کے عہد میں میل کی معیاری لمبائی ۱۷۶۰ گز طے کی گئی جو تقریباً ۱۶۰۹ میٹر کے برابر ہوتی ہے۔ آج پیمایش کا اعشاری نظام دنیا کے بیشتر ملکوں کی طرح ہمارے یہاں بھی رائج ہے۔ یہ نظام فرانس کی رائل اکیڈمی آف سائنسیز نے آٹھارھویں صدی کے آخر میں تیار کیا تھا۔ اس نظام کے تحت لمبائی کی اکائی کی حیثیت سے میٹر کو اختیار کیا گیا۔ میٹر کے لفظی معنی تو ناپنا ہیں لیکن اعشاری نظام کے تحت ایک میٹر کو اس لمبائی کے برابر سمجھا گیا جو پیرس کو قطب شمالی سے جوڑتے ہوئے کرۂ ارض پر بنے دائرے کے اس حصے کے ایک کروڑویں حصے کے برابر ہو جو خط استوا اور قطب شمالی کے درمیان ہے۔

رقبہ ناپنے کے لیے ہندستان میں بیگھا استعمال کیا جاتا تھا۔ اکبری بیگھے میں ۳۶۰۰ مربع الٰہی گز کا رقبہ ہوتا تھا جب کہ ایک الٰہی گز تقریباً ۳۳ انچ کا ہوتا تھا۔ بیگھے کا بیسواں حصہ بسوہ کہلاتا تھا۔ انگریزوں نے بعد میں تین بیگھوں کو ایک ایکڑ کے برابر مانا۔ ایکڑ ایک انگریزی لفظ کی شکل ہے جس کے معنی پہلے کھلی زمین کے ہوتے تھے لیکن بعد میں اس لفظ کو ایسی زمین کے لیے بولا جانے لگا جسے مینڈھ وغیرہ بنا کر گھیر ا گیا ہو۔ بتایا جاتا ہے کہ جب بادشاہ ایڈورڈ اول کو زمین کے رقبے کو ناپنے کے لیے کسی مستقل پیمانے کی ضرورت ہوئی تو

بادشاہ نے ایک جوڑی بیل سے دن بھر ایک کھیت جتوایا اور اس کی پیمایش کروائی اور اپنے فرمان کے ذریعے ایکڑ کی پیمایش چالیس بانس لمبائی اور چار بانس چوڑائی مقرر کی گئی جو کہ بعد میں ۴۸۴۰ مربع گز طے ہوئی۔

انسان کو ناپ کے ساتھ ساتھ تول کی بھی ضرورت پڑی۔ چنانچہ اُسے سامنے جو اشیاء نظر آئیں ان ہی کی مدد سے اپنے پیمانے تیار کیے۔ چاول عام استعمال کی چیز تھی۔ اُسے بہت کم مقدار میں تولی جانے والی کمیاب اور قیمتی اشیاء کو تولنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ بعض دواؤں، کشتوں وغیرہ کی خوراک کی مقدار چاول کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے۔ آٹھ چاول کی ایک رتی ہوتی ہے۔ رتی لال رنگ کا ایک خوبصورت بیج ہوتا ہے جس کے سر پر کالے رنگ کا ایک دھبہ ہوتا ہے۔ اسے عام طور پر گھونگچی یا گوچی بھی کہا کرتے ہیں۔ وزن کے لیے آٹھ چاول کے برابر ایک رتی مانی جاتی ہے۔ رتی سے اوپر ماشے کا وزن ہوا کرتا تھا۔ ماش یعنی اُڑد کے دانے کو آٹھ رتی کے برابر سمجھتے تھے۔ اس کے بعد تولہ ہوتا تھا جو ظاہر ہے کہ تولنا کے لفظ سے گڑھا گیا تھا۔ ایک تولے میں بارہ ماشے ہوا کرتے تھے اور اکثر ایک کلدار روپیا یعنی سرکاری ٹکسال میں گڑھا ہوا روپے کا سکہ ایک تولہ وزن تولنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہندستان کے الگ الگ علاقوں میں الگ الگ وزن کے سیر ہوا کرتے تھے۔ انگریزوں کی عملداری میں اسی (۸۰) تولے کا سیر چلتا تھا۔ اور پھر چالیس سیر کا من ہوتا تھا۔ زبان کے ماہرین نے تحقیق کی ہے کہ "من" کا لفظ ہندستان کے مغرب میں دور دور تک مختلف شکلوں میں بولا جاتا تھا۔ اس کی ابتدا غالباً عکادی زبان میں ہوئی تھی اور بابل میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ لفظ عربوں کے ہندستان کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھنے کے دوران آٹھویں یا نویں صدی میں اس ملک میں پہنچا لیکن سنسکرت میں وزن کے لیے ایک لفظ "منا" ملتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "من" پہلے سے ہندستان میں موجود تھا۔ پرتگالیوں نے ہندستان پہنچ کر اس لفظ کو "ماؤں" کی شکل میں اختیار کیا جس سے انگریزوں نے MAUND بنالیا۔ بعض علاقوں میں دو من کی ایک مانی بھی رائج تھی۔

انگریز اپنے ساتھ اپنا نظام پیمایش لائے جس میں چھوٹے پیمانوں میں "گرین" یعنی دانہ تھا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابتداً اس سے مراد جو کا دانہ ہوتا تھا۔ بڑا وزن پونڈ تھا۔ "پاؤنڈ"

کے لفظی معنی "وزن" کے تھے۔ ۲۲۴۰ پونڈ کا ایک ٹن ہوتا تھا۔ ٹن دراصل شراب وغیرہ کے ایک بڑے ڈرم کو کہتے تھے۔ اب یہ لفظ انگریزی زبان میں تھوڑے املا کے فرق کے ساتھ TONNE اعشاری نظام کے تحت ایک ہزار کلوگرام وزن کے لیے بولا جاتا ہے۔ جہاں تک خود لفظ گرام کا تعلق ہے یونانی زبان میں گرام حروف تہجی میں سے کسی حرف کو کہتے ہیں۔ بعد میں اس سے کسی بھی قسم کی چھوٹی اکائی مراد لی جانے لگی اور اٹھارھویں صدی میں فرانس میں اسے وزن کی کی سب سے چھوٹی اکائی کی شکل میں اختیار کیا گیا۔ "کلو" یونان میں ہزار کے لیے آتا ہے اور جدید پیمانوں میں کلوگرام یا کلومیٹر سے ایک ہزار کلو گرام یا ایک ہزار میٹر مراد لیا جاتا ہے۔

پٹرول وغیرہ سیال چیزوں کی پیمائش کے لیے گیلن کا پیمانہ رائج تھا کے اصل معنی شراب کے جگ کے تھے لیکن یہ پیمانہ دھیرے دھیرے بڑھ کر ۲۷۷ء۴ مکعب انچ کے برابر ہو گیا۔ آج کل لیٹر کا پیمانہ رائج ہے۔ لیٹر دراصل بحیرۂ روم میں واقع جزیرے سسلی کے ایک سکے کا نام تھا لیکن جب یہ لفظ یونانی سے لاطینی میں پہنچا تو ایک پیمانہ بن گیا اور ۱۷۹۳ء میں فرانس میں اسے نئے اعشاری نظام میں برتن میں سیال چیز کو بھر کر ناپنے کے پیمانے کی اکائی شکل میں ایک بنیادی حیثیت دی گئی۔

وقت کو ناپنے کی بھی انسان کو ضرورت پڑی۔ ہندستان میں دن رات کو ساٹھ گھڑی میں تقسیم کیا گیا۔ یہ تقسیم جیوتش کے حساب پر مبنی تھی۔ پھر دن رات کے آٹھ پہر ہوا کرتے تھے اور ہر پہر تین گھنٹے کا ہوتا تھا۔ پہر کے دوران پہریدار چوکی پر رہتے اور ہر گھنٹہ پورا ہونے پر دھات کے بنے گھنٹے پر چوٹ دے کر یہ اعلان کرتے کہ وہ پہرے پر ہیں اور دوسرے یہ کہ وقت کیا ہوا ہے۔ ہر چوتھے گھنٹے پر گجر بجائی جاتی یعنی چار گھنٹوں کے ساتھ چار چوٹیں مزید لگائی جاتیں۔ اسی طرح آٹھ بجے آٹھ گھنٹوں کے ساتھ آٹھ مزید چوٹیں اور بارہ بجے بارہ گھنٹوں کے ساتھ بارہ چوٹیں مزید لگائی جاتیں اور اسے یہ اندازہ ہوتا رہتا کہ کب پہرہ بدلا جاتا ہے۔

بابل کے لوگوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک دائرے کو چھ برابر حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' ساٹھ ساٹھ کے چھوٹے حصوں میں اکائی کو تقسیم کرنے کا رواج ڈالا تھا۔ اسی بنا پر ایک گھنٹے کو پہلی بار ساٹھ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کو لاطینی میں -PARS MI

NUTA PRIMA ' یعنی پہلا چھوٹا حصہ کہا گیا۔ مختصراً اس حصے کا نام "منٹ" پڑ گیا۔ جس کا مطلب صرف "چھوٹا" ہوتا ہے اور اسی وجہ سے عربی میں منٹ کا ترجمہ دقیقہ کیا جاتا ہے۔ ہر منٹ کو مزید ساٹھ حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے لاطینی میں اسے PARS MI-NUTA SECUNDA یعنی دوسری بار چھوٹا حصہ کہا گیا۔ اس سے مختصراً سیکنڈ کا نام پڑ گیا جس کی بنیاد پر عربی میں سیکنڈ کا ترجمہ ثانیہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں دن کا وقت انسان کی ضرورتوں کو زیادہ پورا کرتا ہے اس سے اس نے پورے چوبیس گھنٹوں کا نام ہی دن رکھ دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیوتش کا مطالعہ اکثر جزا رہا ہے۔ اس علم میں سات اجرام فلکی کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اس بنا پر اکثر دنوں کے نام ان سات سیاروں وغیرہ کے نام پر رکھ کر سات دنوں کا ایک ہفتہ مقرر کیا گیا۔ جیسے ہندستان میں اتوار یار ویوار سورج سے 'سوم وار سوم یعنی چاند سے 'منگل وار منگل یعنی مریخ سے 'بدھ وار بدھ یعنی عطارد سے 'برہسپت وار 'برھسپتی یعنی مشتری سے۔ شکروار شکر یعنی زہرہ سے اور شنی وار شنی یعنی زحل سے منسوب ہیں۔ مہینے کا تصور ماہ یعنی چاند سے ہے۔ چاند کی گھٹتی بڑھتی شکلوں کا ایک دور جس عرصے میں ختم ہوتا تھا اُسے ایک ماہ کہا گیا لیکن بعض حالات زیادہ طویل عرصے میں دوبارہ نمودار ہوتے ہیں جیسے موسم۔ مثلاً ایک برسات کے بعد دوسری برسات آنے میں بارہ ماہ کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس کو برس کہا گیا۔ "برس" کا لفظ سنسکرت لفظ "ورش" سے متعلق ہے اور "ورش" "ورشا" سے نکلا ہے۔

کبھی کبھی بعض چیزوں کو ایک خاص تعداد یا مقدار میں اکٹھا رکھ کر ان کے بارے میں بات کرنے کی بھی انسان کو ضرورت پڑتی ہے۔ قدیم انسان کے پاس گنتی کرنے کا سب سے آسان ذریعہ انگلیاں تھیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں "بیسا" اکثر استعمال ہوتا تھا جس کا مطلب تھا ہاتھوں اور پیروں کی کل بیسوں انگلیاں۔ جب ایک سے زیادہ بیس بیس چیزوں کے مجموعے کی بات کرنا ہوتی تو اس کے لیے ایک کوڑی یا کنکر یا کوئی اور چیز یادداشت کے لیے الگ کر کے رکھ دی جاتی۔ اس لیے بعض اوقات بیس چیزوں کی ایک کوڑی بھی کہی جاتی۔ یوروپ وغیرہ میں بیس کے لیے کہیں ایک نشان بنا دیا جاتا جیسے لکڑی میں چاقو سے ایک نشان بنا دیتے۔ اس نشان کو اسکور کہا جاتا تھا اور اسکور سے کبھی بیس چیزوں کا مطلب بھی لیتے تھے۔ اب یوروپ سے لایا گیا درجن کا لفظ بھی بہت استعمال ہوتا ہے۔ درجن بارہ

کے لفظ سے نکلا ہے۔ یوروپ میں بارہ کو جہاں حساب و کتاب میں تین اور چار دونوں سے تقسیم ہو جانے کی وجہ سے اہمیت حاصل رہی ہے وہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ خاص شاگردوں یا حواریوں کے سبب بارہ کو ایک متبرک عدد بھی سمجھا جاتا رہا ہے۔ بارہ درجن کا ایک گُرس ہوتا ہے گرس کا لفظ فرانسیسی لفظ گراس سے نکلا ہے جس کا مطلب بہت سا یا ڈھیر سا ہوتا ہے۔ بارہ گرس کا ایک مہا گرس یا گریٹ گراس سمجھا جاتا ہے۔

کاغذ کے شمار کے لیے چوبیس تختوں کا ایک دستہ اور بیس دستوں کا ایک رم مانا جاتا تھا۔ کاغذ کی ایک شیٹ کو تختے کا نام دیا جاتا تھا۔ کاغذ کی لگدی کو کپڑا لگے فریموں پر پھیلا کر یہ تختے بنائے جاتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ فریموں پر الگ الگ شیٹوں کی شکل میں بنائے جانے کی وجہ سے انھیں تختہ کہا جاتا بلکہ لکھنے کی مشق کرنے کے لیے جو بورڈ استعمال کیے جاتے تھے ان کے لیے پہلے سے تختی کا لفظ بولا جاتا تھا۔ کاغذ کے تختوں میں موڑنے کی وجہ سے شکنیں نہ پڑیں اس لیے انھیں لپیٹ کر رول بنالیا جاتا تھا جس سے کاغذ کو مٹھی میں پکڑنے میں آسانی ہوتی تھی۔ اس ایک مٹھا کاغذ کو دستے کا نام دیا گیا۔ رم کا لفظ REAM انگریزی سے آیا تھا۔ یہ انگریزی لفظ عربی لفظ رِزمٌ سے بنا تھا جس کا مطلب ڈھیر یا انبار ہوتا ہے۔

پوشاکوں کے نام

پوشاکوں کے نام کس طرح پڑے، یہ بجائے خود مطالعہ کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف لباس کے فیشن بدلے بلکہ لباسوں کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں آئی ہیں۔

مردانہ لباس میں قمیض کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ حرف صاد کے ساتھ لفظ "قمیص" قرآن حکیم میں آیا ہے۔ سورہ یوسف میں ملاحظہ فرمایئے۔ وجاوا علی قمیصه بدم کذب (سورہ ۱۲ آیت ۱۸) لیکن یہ لفظ بہت پرانا ہے اور قدیم یونانی ریکارڈ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ بازنطینی حکمراں بھاری بھر کم خلعت پہنا کرتے تھے جو سونے چاندی کے تاروں اور ریشم وغیرہ کے بنے ہوئے ہوتے تھے اور ان پر طرح طرح کے جواہرات کا کام ہوتا تھا۔ اس بھاری اور قیمتی خلعت کو پسینے وغیرہ سے اور اس کی رگڑ سے جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک سادہ کپڑے کا لباس اندر پہنا جاتا تھا۔ اس لباس کو کامیسا کا نام دیا جاتا تھا۔ بعد میں اس کو شب خوابی کے لباس کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ ہندستان میں اوپری جسم کے لیے مردانہ لباس کو بالعموم کرتا، نیمہ وغیرہ کہا جاتا تھا۔ پرتگالیوں کے ساتھ یوروپی انداز کی شرٹ نے ہندستان میں رواج پایا اور اس کے لیے پرتگالی لفظ CAM-ISA "ضاد" کے تلفظ کے ساتھ رائج ہوا اور اب عام طور پر قمیض (ضاد کے ساتھ) بولا جاتا ہے۔

یوروپی لباس کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ ہندستان میں پتلون کا رواج بڑھا۔ یہ نام اٹلی سے ہم تک پہنچا۔ سولھویں صدی عیسوی میں اٹلی کے شہر ونیس کے قرب وجوار میں چکر لگا کر ناٹک دکھانے والی منڈیوں میں ایک مسخرہ کردار ہوتا تھا۔ اس کے لیے کسی دبلے پتلے بوڑھے شخص کو ایک ڈھیلے ڈھالے پاجامے جیسا لباس اور ڈھیلی ڈھالی چپلیں

پہنائی جاتی تھیں۔ یہ شخص اپنی اچھل کود اور احمقانہ حرکتوں سے لوگوں کو ہنسایا کرتا تھا۔ اس کردار کو "پنٹالون" کہتے تھے۔ یہ نام سینٹ پنٹالیونی کے نام پر تھا جسے وینس کے معالج اپنا روحانی سرپرست سمجھتے تھے لیکن عام لوگ معالجوں کی لوٹ کھسوٹ، سخت دلی اور بد کلامی کے شاکی تھے چنانچہ جب ناٹک منڈلی کے مسخرے سینٹ پنٹالیونی کا سوانگ بھر کر ان معالجوں کا مذاق اڑاتے تو تماشائی بہت لطف لیتے۔ ان مسخروں کے ساتھ ان کا مخصوص لباس بھی مقبول ہوا اور دھیرے دھیرے اس پائجامے کا نام ہی پنٹالون پڑ گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وضع قطع اور پہناوے کا انداز بھی بدل گیا۔ یہی نہیں یوروپ والوں کے ساتھ اس لباس کے ہمارے ملک میں پہنچنے کے بعد اس کا نام بھی بدل کر پتلون ہو گیا۔

آج کل نوجوانوں میں نیلے، موٹے سخت کپڑے کے پتلون بڑے مقبول ہیں جنھیں جینس کہا جاتا ہے۔ یہ نام دراصل اٹلی کے شہر جنوا کی یاد دلاتا ہے جہاں شروع میں اس قسم کا مضبوط، موٹا، سوتی کپڑا بنایا جاتا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں اس کپڑے کو عام طور پر مشقت کا کام کرنے والے مزدوروں یا کھلاڑیوں کے کے لباس کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ کپڑا گہرے رنگوں میں یا دھاری دار بھی ہوتا تھا لیکن نیلے رنگ کا کپڑا زیادہ مقبول تھا۔ ۱۸۵۰ء میں جب لیوای اسٹراس امریکا کے علاقے کیلی فورنیا میں سونے کی تلاش میں گیا تو اس نے اس کپڑے کا نیلے رنگ کا پتلون استعمال کیا۔ اسے خاص خاص جگہوں پر مضبوط بنانے کے لیے تانبے کے ربٹ بنائے گئے تھے۔ تب سے اس قسم کے جینس رواج میں آگئے۔

نیکر کا لفظ بھی ہندستان میں مغرب سے ہی آیا جہاں شروع میں نیکر عورتوں کا پہناوا تھا۔ عورتوں کے یہ نیکر اونی یا ریشمی ہوتے تھے اور انھیں عام طور پر جاڑے کے موسم میں پہنا جاتا تھا۔ یہ کولھوں پر توڈھیلے ہوتے تھے مگر انھیں گھٹنوں پر اتنا تنگ رکھا جاتا تھا کہ وہ پنڈلی کے اوپری حصے پر بالکل کس جائیں اور سرد ہوا کا گھٹنوں کے اوپر گزر نہ ہو۔ امریکا میں نیکر مردوں کا لباس بن گیا اور لوگ گولف وغیرہ کھیلتے وقت اس کا استعمال کرنے لگے۔ امریکا میں یہ لباس ڈچ لوگوں کے ساتھ پہنچا۔ ان کا یہ ڈھیلا ڈھالا لباس کافی عرصے تک لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنا رہا۔ نیکر کا نام بھی اسی مذاق کا نتیجہ ہے۔ امریکا کے مصنف واشنگٹن اورنگ نے مسخرے پن سے بھرا ہوا ایک ڈراما لکھا۔ اس نے اس میں نیکر بوکر نام کا ایک کردار پیش کیا تھا۔ اس کردار کی تصویروں میں اسے یہی لباس پہنے دکھایا گیا تھا۔ پھر یہ

نام چل پڑا۔ ہندستان میں یہ لباس اب اپنی اصل شکل میں نہیں ہے اور ہم اکثر ہاف پینٹس کو ہی نیکر کا نام دیتے ہیں۔

نسوانی لباس میں ہندستان میں فراک کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ فراک شروع میں مردانہ پہناوا تھا اور اسے خاص طور پر راہب اور پادری پہنا کرتے تھے۔ جب کبھی یہ پایا جاتا کہ کسی نے پادری کے شایان شان کام نہیں کیا۔ تو سزا کے طور پر اسے پادریوں کی برادری سے نکال دیا جاتا اور اسے فراک پہننے کی ممانعت کر دی جاتی۔ فراک سے یہ محرومی ایک بڑی بے عزتی سمجھی جاتی تھی۔ اسی طرح کھیتوں میں کام کرنے والے بھی ایک قسم کا فراک پہنا کرتے تھے۔ شہر میں کام کرنے والوں کے رسمی لباس کا حصہ ان کا فراک کوٹ ہو جاتا تھا جس کے لمبے اور نوک دار دامن پیچھے کی طرف لٹکتے رہتے تھے۔ انیسویں صدی میں فراک چھوٹی لڑکیوں کے لباس کا حصہ بنا اور زیادہ عمر کی لڑکیوں اور خواتین کے لیے اسے بیسویں صدی کی ابتداء میں اپنایا گیا۔

اسکرٹ آج کل نسوانی لباس کا حصہ ہے لیکن قدیم انگریزی زبان میں یہ لفظ جسم کے بالائی حصے میں پہنے جانے والے قمیص جیسے لباس کے لیے استعمال ہوتا تھا بلکہ قمیص کے لیے انگریزی لفظ ''شرٹ'' کو اسی لفظ کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے۔ بعد میں اسکرٹ سے دامن مراد لیا جانے لگا اور پھر اس سے لباس کا وہ حصہ جو جسم میں نیچے تک آئے۔ اس لحاظ سے جب کہ جسم کے اوپری حصے کے پہناوے کے لیے شرٹ کا لفظ اختیار کیا گیا، جسم کے نچلے حصے کے لباس کے لیے اسکرٹ کو لے لیا گیا لیکن کیونکہ اسکرٹ کے لفظ میں ابھی بھی دامن کا لفظ کہیں باقی رہ گیا تھا اس لیے بجائے مردانہ لباس کے صرف ایسے زنانہ لباس کے لیے مخصوص ہو گیا جس میں لمبا گھیر اور دامن ہو۔

لفظ پیٹی کوٹ نے بھی اسی طرح معنوی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ آج کل پیٹی کوٹ خاص عورتوں کا پہناوا ہے جو کہ ہمارے ملک میں ساڑی کے نیچے پہنا جاتا ہے لیکن اس کا سیدھا سادہ مطلب ''چھوٹا کوٹ'' ہے اور چودھویں صدی عیسوی میں انگلستان میں مرد اور عورت دونوں اسے اپنے کوٹ کے اندر جیکٹ کی طرح پہنا کرتے تھے۔ بعد میں عورتوں نے سامنے سے کھلے ہوئے گاؤن کے نیچے پہننے کے لیے جو چھوٹے کوٹ بنوانا شروع کیے ان کے دامن لمبے اور کڑھے ہوئے ہونے لگے۔ پھر جب سامنے سے کھلے گاؤن کا فیشن ختم

ہو گیا تو اس چھوٹے کوٹ کی اوپری حصے کی ضرورت باقی نہ رہی اور صرف نیچے کا حصہ رہ گیا اور اسی نے آج کی پیٹی کوٹ کی شکل اختیار کر لی۔

کپڑوں کے نیچے پہنے جانے والے کپڑوں میں سے ایک بنیان ہے۔ اب اس کی پرانی شکل بہت بدل گئی ہے۔ دراصل اس لباس کا نام بنیوں کی قوم سے اس کی نسبت کی بنا پر پڑا۔ شروع میں خاص طور پر گجرات کے بنیے ایک قسم کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا کرتے تھے جو اکثر کولھوں سے اوپر رہتا تھا۔ جب کہیں باہر جانا ہوتا یا سفر پر جاتے تو اس کے اوپر ایک اور لباس پہن لیا کرتے جو رانوں تک آتا۔ جب یوروپ کے باشندے اس حصے میں تجارت کی غرض سے آئے اور یہاں رہایش اختیار کی تو انھیں بھی ہندستان کے گرم موسم میں اندر پہنے جانے والا یہ لباس آرام دہ معلوم ہوا اور انھوں نے گھر کے اندر اسے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بعد میں انھوں نے اس کی وضع میں تبدیلیاں کیں اور جب مشینوں کا استعمال بڑھا تو موزوں کی طرح بنیان بھی مشین سے بنوا کر استعمال کرنے لگے۔ بنیان کی ایک قسم آج کل سینڈو کہلاتی ہے۔ دراصل یہ سینڈو نامی ایک پہلوان کے نام پر ہے جس نے اپنے زمانے میں عالمگیر شہرت حاصل کی۔ یہ پہلوان اس مصلحت سے کہ کشتی کے دوران آستینیں اس کے داؤ پیچ میں رکاوٹ نہ بنیں بغیر آستین کی بنیان پہنا کرتا تھا۔ اسی نسبت سے بعد میں بغیر آستین والی بنیانیں سینڈو کہلانے لگیں۔

سردی سے بچاؤ کے لیے سوئٹر استعمال کیے جاتے ہیں۔ سوئٹر کے لفظی معنی پسینہ لانے والے کے ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بعض اوقات مریض کو پسینہ دلانے کی غرض سے ایک موٹا گاؤن جیسا لباس استعمال کیا جاتا تھا اسے سوئٹر کہتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں کھلاڑیوں اور کشتی چلانے والوں کے لیے ایسی اونی جرسیاں رواج میں آئیں جو پسینے کو جذب کر سکیں۔ دھیرے دھیرے سوئٹر سردی سے محفوظ رہنے کا ایک عام لباس بن گیا۔

جسم کے اوپری حصے کو سردی وغیرہ سے بچانے کے لیے جرسیاں بھی پہنی جاتی ہیں۔ دراصل جرسی اس پہناوے کا نہیں بلکہ اس جگہ کا نام ہے جہاں یہ پہناوا سب سے پہلے شروع ہوا۔ جرسی انگلستان کے قریب رود بار انگلستان (انگلش چینل) میں واقع سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ وہاں کے لوگوں کا خاص پیشہ مویشی پالنا ہے اور جرسی نسل کی مویشی دنیا بھر

میں مشہور ہے۔ یہاں اون کا بھی بہت زمانے سے کام ہوتا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہاں وہ اونی جاکٹیں بننا شروع ہوئیں جنھیں اب سب جرسی کہتے ہیں۔ پہلے جرسیاں مچھیرے اور ملاح پہنا کرتے تھے کیونکہ جرسیاں سمندر کے پانی کے چھینٹوں اور بوچھار کو جذب کر لیتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں کھیلوں کی مقبولیت بڑھنے کے بعد جرسیاں کھلاڑیوں میں بھی مقبول ہوئیں اور یہ لباس ساری دنیا میں عام ہو گیا۔

ہندستان میں سردی کے موسم میں مرزئی پہننے کا رواج تھا۔ یہ پوشاک مرزاؤں سے منسوب کی گئی تھی۔ لفظ مرزا اکثر بطور لقب استعمال ہوتا تھا اور مغل شہزادوں کے نام کے ساتھ بھی لگایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر "مرزا مزاج" کہہ کر مزاج کی نفاست کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے عام لوگ صدری یا شلوکا پہنتے تھے لیکن امراء اپنے لیے خوبصورت "آستینوں دار پوشاک تیار کراتے جس میں دو کپڑوں کے بیچ روئی رکھ کر سی جاتی تھی۔ روئی کو اپنی جگہ قائم رکھنے کے لیے لگائے گئے ٹانکوں سے خوبصورت ڈیزائن بنائے جاتے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے اس فیشن ایبل شہزادوں جیسے پہناوے کو مرزائی شلوکا کہا جانے لگا جو عام زبان میں مرزئی ہو گیا۔

ہندستان میں ایک زمانے میں پشواز پہننے کا بھی رواج تھا۔ دراصل پشواز فارسی لفظ "پیش باز" (یعنی سامنے سے کھلنے والا) کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ قبائے پیش باز ایک ایسی ٹخنوں تک پہنچنے والی ڈھیلی ڈھالی پوشاک ہوتی تھی جو سامنے سے کھلی ہوتی تھی اور اسے عام طور پر درویش پہنتے تھے۔ ہندستان میں اکثر عورتیں چولی اور لہنگے پہنتی تھی جس سے عورتوں کی پوری طرح ستر پوشی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے چولی اور لہنگے کو جوڑ کر پشواز کی شکل دی جسے عام طور پر پیشہ ور عورتیں جسے نائنین، چوڑیاں یا سبزی بیچنے والیاں، رنڈیاں، ڈومنیاں وغیرہ پہنتیں۔ یہاں تک کہ نٹ اور بھانڈ وغیرہ مرد بھی تماشا دکھاتے وقت پشواز پہن لیا کرتے تھے۔ دلہنوں کو بھی رسماً پشواز پہنائی جاتی تھی۔

اس طرح تقریباً ہر پوشاک اپنے دامن میں ایک داستان چھپائے ہوئے ہے جو دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔

کپڑوں کے ناموں کی داستان

پوشاک تیار کرنے، اوڑھنے، بچھانے وغیرہ کے لیے جن طرح طرح کی قسموں کے کپڑے استعمال کیے جاتے ہیں اُن کی شناخت کے لیے مختلف نام وضع کئے گئے ہیں۔ ان ناموں کی ابتداء کس طرح ہوئی، ان کے اصلی معنی کیا تھے اور بعد میں ان میں کیا تبدیلیاں آئیں یہ بجائے خود مطالعے کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اگلے صفحات میں ایسے ہی بعض ناموں کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

ان ناموں کی اگر درجہ بندی کی جائے تو تین قسم کی ناموں پر خاص توجہ دی جاسکتی ہے۔

(۱) ایسے نام جو ان کپڑوں کے بعض مقامات سے نسبت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سے بکرم، پاپلین، پرمٹا، چھانٹی (شان ٹنگ)، ڈنگری، ڈینم، زین، ساٹن، سوسی، کے لیکو، کیمرک، گاج، گبرون، مارکین، مسلن اور ورسٹڈ کا تفصیلی ذکر آگے کیا جارہا ہے۔

(۲) ایسے نام جو کپڑوں کی بناوٹ یا ان کے ڈیزائن وغیرہ کو ظاہر کرتے ہیں جیسے الوان، بادلا، بافتہ، بانات، بروکیڈ، بندھنا، پھلکاری، تافتہ (تافے ٹا)، ٹوئل، چکن، چوتارا، چوخانہ (چیک)، چوتہی، چھینٹ، خاکی، دوسوتی، زربفت، گاڑھا، گزی، گمٹی، لٹھا، مخمل، مشجر، ململ، ملیدہ، نرما، یک تار او غیرہ۔

(۳) ہندستان میں تیار ہونے والے کپڑوں کی ایک خصوصیت ان کے خوبصورت شاعرانہ نام تھے جو ان کپڑوں کی نفاست کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے جیسے آبِ رواں، البیلی، بادلا، جامہ وار، نین سکھ، تن سکھ، پرکالا، سرشاد، شیر و شکر، شبنم، تن زیب، طرح اندام، دھوپ چھانو، پھوار، تاش، رعنا، گلشن، گلبدن، موج لہر وغیرہ

ان ناموں میں سے بعض کی تفصیلات حروف تہجی کی ترتیب سے درج ذیل ہیں:

(۱) آب رواں : یہ ململ کی ایک بہت باریک اور خوبصورت قسم تھی۔ اس کا نام اس کی سبک نفاست کو ظاہر کرتا تھا۔ اس کپڑے کے بارے میں عام طور پر دو روایتیں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ جب اورنگ زیب نے اپنی بیٹی زیب النساء سے اس بات پر ناراضگی ظاہر کی کہ وہ شہنشاہ کے سامنے ایسے لباس میں حاضر ہوئی جس میں سے اس کے جسم کا رنگ جھلکتا ہے تو شہزادی نے جواب دیا کہ اس نے آبِ رواں کے سات جامے زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ دوسری کہانی نواب علی وردی خاں کے زمانے کی ہے جب ایک جولاہے کی اس وجہ سے فہمائش کی گئی اور اسے شہر سے نکال دیا گیا کہ اس نے آب رواں کا ایک ٹکڑا گھاس پر پھیلا دیا تھا جسے گائے کھا گئی کیونکہ وہ کپڑے اور گھاس میں جو اس کے نیچے دکھائی دے رہی تھی تمیز نہ کر سکی۔ ان روایتوں میں چاہے کتنا ہی شاعرانہ مبالغہ ہو' آب رواں اپنے وقت کی نہایت نفیس ململ تھی اور یورپ کی تجارتی کمپنیاں اسے ہندستان سے بر آمد کرتی تھیں اور یہ انگریزوں میں ''ابرون'' کے نام سے معروف تھی۔

(۲) اطلس : ایک قسم کا ریشمی کپڑا اطلس کہلاتا تھا۔ جس عربی مادّے سے یہ لفظ نکلا ہے اس کے ایک معنی خاکستری مائل بہ سیاہی ہوتا ہیں۔ ابتداءً یہ نام اس کپڑے کے رنگ کو ظاہر کرتا تھا۔ بعض زباندان اس مادّے کے گنجے یا بلا بال کے ہونے کے معنی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس سے کپڑے کی اس خوبی کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اس میں رواں نہیں ہوتا ۔ سونے چاندی کے تاروں کے ساتھ بنایا جانے والا یہ کپڑا اٹھارہویں صدی میں ہندستان سے یوروپ کو بر آمد کیا جاتا تھا اور یہ اطلس کے علاوہ انڈین ساٹن کے نام سے بھی معروف تھا۔

(۳) الوان : پشمینے یا اون کی چادر یا کمبل کو الوان کہتے ہیں۔ دراصل یہ عربی لفظ ''لون'' کی جمع ہے جس کا مطلب ''رنگ'' ہوتا ہے۔ اس سے رنگ برنگے پشمینے کی جانب اشارہ ہے۔ بعد میں رنگ برنگی اونی چادر کے لیے استعمال ہونے لگا۔

(۴) بابر لیٹ (بابل لیٹ) : یہ نام ایک قسم کی مشین سے بنی نفیس جالی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دراصل یہ انگریزی الفاظ BOBBIN-NET اور BOBBINET کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس کے معنی ایسی جالی کے ہیں جو بابن (BOBBIN) سے بنائی جائے۔ بابن اُس ریل کو کہتے ہیں جس میں تاگا وغیرہ لپیٹا جاتا ہے اور دونوں جانب اس میں نکیلے

سرے نکلے ہوتے ہیں جنہیں سوراخ میں ڈال کر بابن سمیت تاگا باہر نکالا جاتا ہے۔ مچھلی پکڑنے کے لیے جال ہاتھ سے بنانے کے واسطے مچھیرے بابن استعمال کرتے ہیں۔ ابتداء یہ جالی لیس کی شکل میں چھوٹے بابن (BOBBINET) سے ہی بنائی جاتی تھی۔ اب مشین کے استعمال سے جالی زیادہ نفیس اور مضبوط بننے لگی ہے لیکن اس کا وہی پرانا نام استعمال ہوتا ہے۔

(۵) بادلا: ایک قسم کا ریشمی کپڑا جس پر چاندی کا کام ہوتا ہے۔ بادل سے یہاں دراصل آسمان مراد ہے جس پر رات کو ستارے جگمگاتے ہیں۔ بادلے کی جھلملاہٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے آسمان کے ستاروں سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ بادلا ان سونے چاندی کے تاروں کو بھی کہا جاتا ہے جنہیں کپڑے پر ٹانک کر نقش و نگار بنائے جاتے ہیں۔

(۶) بافتہ: اس کپڑے کا نام فارسی مصدر "بافتن" یعنی بننا، بنائی کرنا سے ہے۔ اور اس کا سیدھا سادہ مطلب بُنا ہوا ہے۔ بافتہ کافی عرصے تک یوروپ کو برآمد کیا جاتا رہا خاص طور پر بھڑوچ کا سوتی بافتہ بہت مشہور تھا۔ بنگال میں بھی سوتی بافتہ تیار ہوتا تھا لیکن بنارس وغیرہ میں ریشمی بافتہ بھی بنایا جاتا تھا جس پر کلابتون یا کپڑے کی بوٹیاں ہوتی تھیں اور اسے انگرکھوں اور عورتوں کے پاجاموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

(۷) بانات: ایک قسم کا اونا دبیز کپڑا۔ دراصل یہ بانے اُس دھاگے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کپڑے کے عرض میں لگایا جاتا ہے۔ غالباً عربی کی مونث جمع کی طریقے پر بانا میں "ات" جوڑ کر اس میں کثرت کا مطلب پیدا کرنا چاہا ہے کیونکہ بانات کا عرض عام کپڑوں کے عرض سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۸) بروکیڈ: یہ لفظ پہلے BROCADO تھا اور یہ اسپینی لفظ BROCA سے بنا تھا جس کا مطلب "گھنڈی" ہوتا ہے۔ گھنڈی سے مراد کپڑے میں ابھرنے والا وہ ڈیزائن ہے جو بناوٹ میں مزید دھاگوں کو ضروری شکل پیدا کرنے کے لیے شامل کر کے بنایا جاتا ہے۔ اس طرح بوٹی کی جگہ کپڑے کی سطح سادہ کپڑے کی سطح سے نسبتاً زیادہ موٹی ہو جاتی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کا کپڑا سب سے پہلے چین میں بنایا گیا تھا اور جیسا کہ ابتدائی تذکروں سے معلوم ہوتا ہے شروع میں رنگین کپڑے پر کشیدہ کاری کر کے اس قسم کا کپڑا بنایا جاتا تھا۔ کشیدہ کاری کے لیے بھی BROCH کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ

ابتدائی کشیدہ کاری اور اسے مشابہت بھی BROCADE کی اصل مانی جاسکتی ہے۔ بروکیڈ کی امتیازی خصوصیت بہر حال کپڑے کی بناوٹ میں ہی شامل مختلف قسم کی ڈیزائن ہیں چاہے اُن ڈیزائنوں کو ابھارنے کے لیے سونے چاندی کے تاروں کا استعمال کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو

(۹) بکرم: یہ موٹا اور دبیز کپڑا عام طور پر پوشاک کے کسی حصے جیسے کالر یا کف وغیرہ کو اندر سے سخت رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ابتداءً یہ کپڑا اوسط ایشیاء کے شہر بخارا میں بنایا جاتا تھا۔ یہ ایک موٹا کپڑا ہوتا تھا جس کو نفیس قالینوں کے نیچے بچھایا جاتا تھا تاکہ وہ فرش کے گردو غبار سے خراب نہ ہوں۔ بخارا کی اسی نسبت سے اس کا جو نام پڑا اس نے اب بکرم کی شکل اختیار کر لی ہے۔

(۱۰) پاپلین: اس کپڑے کا نام فرانسیسی لفظ POPELINE پر مبنی ہے پاپلین کے لفظی معنی ہیں "پوپ کا"۔ دراصل اب یہاں اوگ نان (AVIGNON) نامی فرانس کا وہ شہر مراد ہے جو ایک زمانے میں پوپ کی علاقائی حکومت کا صدر مقام تھا۔ اسی شہر میں سترہویں صدی میں یہ کپڑا بننا شروع ہوا جو کہ بعد میں یوروپ میں بڑا مقبول ہوا۔

(۱۱) پرمٹا: ایک قسم کا سوتی اونی کپڑا جس کا نام آسٹریلیا کے علاقے نیو ساؤتھ ویلز میں واقع شہر پرمٹا (PARAMATTA) پر مبنی ہے۔

(۱۲) تافتہ: فارسی مصدر تافتن سے ہے جس کا مطلب بٹنا اور بل دینا بھی ہے اور چمکنا اور روشن ہونا بھی۔ ہندستان میں یہ ریشمی کپڑا کافی قدیم زمانے سے رائج ہے اور اس کا ذکر "آئین اکبری" میں بھی ملتا ہے۔ یہ کپڑا یوروپ میں درآمد کیا جاتا تھا اور اسے ٹافے ٹا (TAFETTA) کا نام دیا گیا۔ سترھویں صدی میں اسے انگلستان میں درباری لباس میں استعمال کیا جاتا تھا۔ شروع میں یہ ایک سادہ کپڑا تھا لیکن بعد میں اس میں بروکیڈ کی طرح ڈزائن بھی ڈالے جانے لگے اور اس میں دھوپ چھاؤں جیسی چمک بھی دی جانے لگی۔

(۱۳) ٹول: پھول کے وزن پر یہ نام ہندستان میں ایک قسم کے سرخ کپڑے کو دیا جاتا ہے دراصل یہ انگریزی لفظ ٹوئل (TWILL) پر مبنی ہے جو دراصل کپڑے کی ایک قسم کی بناوٹ کا نام ہے جس میں ایک واضح ترچھی بناوٹ کی لائن ابھرتی ہے۔ اس قسم کے کپڑے اونی اور سوتی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ اونی ٹوئلوں میں سرج اور گیبر ڈین اور سوتی ٹوئلوں میں ڈینم مشہور ہیں۔

(۱۴) ٹوئیڈ : ایک کھردرا ساادنی کپڑا جو زیادہ تر جنوبی اسکاٹ لینڈ میں بنایا جاتا ہے۔ اس کا نام اسکاٹ لینڈ کے ایک باشندے کے انگریزی لفظ کی املا میں غلطی سے پڑا۔ اس قسم کے کپڑے کی بُناوٹ ٹوئل (TWILL) جیسی ہوتی ہے جس میں ایک ترچھی بُناوٹ ابھرتی ہے۔ ۱۸۲۳ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک کپڑا بُننے والے نے اس قسم کا کپڑا لندن کے ایک کپڑوں کے سوداگر جیمس لاک (JAMES LOCKE) کو بھیجا اور TWILLED کی املا اسکاٹش انداز سے TWEELED لکھی جسے لاک نے TWEED پڑھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ خیال رہا ہو کہ اس کپڑے کا نام جنوب مشرقی اسکاٹ لینڈ میں بہنے والے دریا TWEED پر رکھا گیا ہے۔ اس غلط فہمی کے ساتھ یہ نام چل پڑا اور اس کپڑے کا تجارتی نام بن گیا۔

(۱۵) ٹیرے لین : اس مصنوعی ریشے کو برطانیہ کے کیلی پرنٹرس ایسوسی ایشن کے جے' آر' ون فیلڈ (J.R.WHINFIELD) اور جے' ٹی ڈکنسن (J.T. DICKIN-ISON) نے دریافت کیا تھا' یہ پولیسٹر ٹیریف تھیلک ایسڈ (TEREPHTHALIC ACID) اور ایتھے لین گلائی کول (ETHYLENE GLYCOL) کے رد عمل سے ظہور میں آتا ہے۔ چنانچہ TEREPHTHALIC میں سے TERE اور ETHYLENE میں سے LENE کے اجزاء لے کر اس کا TERELYNE نام تجویز کیا گیا جو کہ سب سے پہلے ۱۹۵۱ء میں استعمال کیا گیا۔ امریکہ میں شروع میں اسے ڈیکران (DACRON) کا نام دیا گیا

(۱۶) جارجٹ : اس کپڑے کو ۱۹۲۰ء کے قریب میڈم جارجٹ دی لا پلانت (GEORGETTE DELA PLANTE) کے نام پر کریپ جارجٹ کا نام دیا گیا۔ میڈم جارجٹ پیرس میں عورتوں کا لباس ڈزائن کرنے والی ایک مشہور خاتون تھیں۔ بعد میں اس کپڑے کا نام بجائے کریپ جارجٹ کے مختصراً صرف جارجٹ رہ گیا۔

(۱۷) جامدانی : یہ دراصل جامہ دانی سے بنا ہے حالانکہ جامہ دانی چمڑے کے اس صندوق کو کہا جاتا ہے جس میں پہننے کے کپڑے رکھے جاتے ہیں۔ جامدانی ڈھاکے کی نہایت قیمتی ململ شمار کی جاتی تھی۔ اس پھولدار کپڑے میں پھول اور بوٹے بناوٹ میں ہی ڈالے جاتے تھے۔ اس کی نفاست اور قیمت کو دیکھتے ہوئے اس کپڑے کو نہایت حفاظت کے ساتھ جامہ دانی میں رکھا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام جامدانی ہوا۔

(۱۸) جامہ وار : یعنی جو پہننے میں مناسب ہو۔ یہ نام مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں مختلف قسم کے کپڑوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ "آئین اکبری" میں جامہ وار گجرات کے سنہری تار والے کپڑے کو بھی کہا گیا ہے۔ اور ایک قسم کے اونی کپڑے کے لیے یہ نام استعمال کیا گیا ہے۔ فاربس واٹسن (FORBES WATSON) نے کشمیر کی دھاری دار شال کو جامہ دار کہا ہے اور بتایا ہے کہ پنجاب میں پشم اور اون کی دھاری دار چادریں جامہ وار کہلاتی تھیں۔ "نور اللغات" میں ایک قسم کی پھول دار چھینٹ یا اونی پھولدار چادر کو جامہ وار بتایا گیا ہے۔ (۱۳) سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نام کپڑے کی اس خصوصیت کو دیکھتے ہوئے دیا گیا کہ وہ زیب دیتا ہے۔

(۱۹) چکن : یہ فارسی لفظ کپڑے پر سوئی سے خوبصورت کام اور زردوزی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اسے ہندستان میں پہلے ریشمی کپڑے پر کڑھائی کے لیے اختیار کیا گیا اور بعد میں یہ خوبصورت سوئی کے کام والی ایک خاص قسم کی ململ کے لیے استعمال میں آیا جس کا خاص مرکز لکھنؤ رہا ہے۔

(۲۰) چوتارا : ظاہر ہے کہ چار تار کا بنا ہوا چوتارا کہلاتا ہے۔ اس کپڑے کا ذکر "آئین اکبری" میں بھی ملتا ہے۔ آگرے کا سفید چوتارا یوروپ کو برآمد کیا جاتا تھا۔

(۲۱) چوتہی : چار تہ والا۔ ایک قسم کا موٹا کپڑا جو بستر میں بچھانے کا کام آتا تھا۔

(۲۲) چھانٹی : یہ لفظ SHANTUNG کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ شان تنگ چین کا ایک صوبہ ہے۔ شان تنگ نام کا سادہ موٹا کپڑا ریشمی کپڑا چین سے آتا تھا۔ بعد میں یہ لفظ اس قسم کے سادہ سوتی کپڑے کے لیے مستعمل ہونے لگا۔

(۲۳) چھینٹ : چھینٹ ہندستان میں عرصۂ دراز سے تیار ہو رہی ہے اور اس کا ذکر سولھویں صدی میں "آئین اکبری" میں ملتا ہے۔ چھینٹ کا لفظ ظاہر ہے کہ چھینٹ یا قطرے سے تعلق رکھتا ہے اور اس قسم کے کپڑوں پر رنگ کے باریک دھبوں سے بننے والے ڈزائن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بعد میں اس قسم کا کپڑا چھاپ کر تیار کیا جانے لگا۔ جب یوروپ کی تجارتی کمپنیوں نے ہندستان سے بیوپار شروع کیا تو چھینٹ یوروپ بھی برآمد کی جانے لگی۔ انگریزی طریقے سے اس کی جمع بنا کر اسے CHINTZ لکھا جانے لگا۔

(۲۴) خاکی : دھول کی رنگت کا، مٹیالا۔ شروع میں ہندستان میں انگریز فوج کی

وردی سرخ ہوا کرتی تھی اور اسی بنا پر انگریز فوجی لال کرتی والے کہلاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران انگریز سپاہیوں کے خلاف غم و غصہ سے بچنے اور عام لوگوں کو دھوکا دینے کی غرض سے نئے رنگ کی وردی میں نیم فوجی دستوں کو استعمال کرنے کے بارے میں لکھنؤ میں فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لیے ایک ایسا رنگ زیر غور آیا جو سرخ رنگ کی طرح ایک دم نمایاں بھی نہ ہو اور ہندستان کے گرد و غبار میں چھپ بھی جائے۔ یہ رنگ کس طرح طے کیا گیا اس کی دلچسپ روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق سفید وردی کو کافی، ہلدی، مسالے شہتوت کے عرق وغیرہ میں ڈبو کر یہ رنگ مقرر کیا گیا۔ دوسرے روایت کے مطابق یہ رنگ سیاہ و سرخ روشنائی اور گیروا رنگ ملا کر حاصل کیا گیا۔ اس قسم کی وردی سب سے پہلے دہلی کا محاصرہ کرنے والی اس پنجابی رجمنٹ کو دی گئی جس کو میرٹھ وانٹیئر ہارس رجمنٹ کا نام دیا گیا اور جسے ہندستانی میں خاکی رسالہ کہا جاتا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں برطانیہ کے محکمہ جنگ نے خاکی وردی کو عام فوجی لباس کے طور پر اختیار کرنے پر غور کیا اور بعض رسالے خاکی وردی استعمال بھی کرتے رہے۔

اس کو مجموعی طور پر بوئر جنگ (BOER WAR) (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۲ء) میں اختیار کیا گیا۔ فلپائن میں مقیم امریکی فوجوں نے بھی خاکی وردی استعمال کرنا شروع کر دی لیکن انھوں نے اسے چینی کپڑے (CLOTH CHINO) کا نام دیا۔

(۲۵) ڈنگڑی: ہندستان میں آج ہم اس لفظ کو بھول چکے ہیں۔ لیکن ہندستان سے جانے والا یہ لفظ ڈنگڑی یا ڈنگریز کے شکل میں انگلینڈ یا امریکہ میں تعارف کا محتاج نہیں۔ ڈنگڑی کا تعلق ممبئی کے قریب واقع ایک مقام ڈونگر گڑھ سے ہے۔ خود ڈنگر کا لفظ ڈونگری سے نکلا ہے جس کا مطلب چھوٹی پہاڑی ہوتا ہے۔ ڈونگر گڑھ میں ایک قسم کا موٹا کپڑا عام استعمال کے لیے بنایا جاتا تھا۔ اسی قسم کا دبیز کپڑا خیموں اور کشتیوں کے بادبانوں کے کام آتا تھا۔ انگریزوں نے اسے مضبوطی کی وجہ سے پسند کیا اور اسے پہلے ملاحوں کی وردی کے لیے اور پھر کارخانوں اور کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لباس کے لیے استعمال کیا۔ پھر تو یہ بحری فوج اور سمندری جہازوں کے عملے کا مستقل یونیفارم بن گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ کے لوگ بھی اس سے واقف ہوئے اور وہ نوجوان طبقہ جس میں موٹے کپڑے کے پتلون اور جاکٹ مقبول ہیں ان میں ڈنگریز بھی بہت

مقبول ہوئیں۔

(۲۶)دوسوتی : وہ کپڑا جس میں دوہرا سوت یادوہرا دھاگا لگا ہو۔ یہ موٹے قسم کا سستا کپڑا چادر وغیر کی شکل میں عام استعمال میں آتا تھایااسے خیموں یافرش وغیرہ میں لگایا جاتا تھا۔

(۲۷)دیبا : یہ ایک قسم کا نہایت قیمتی کپڑا ہوتا تھا جو کے ریشم اور سونے کے تاروں سے تیار کیا جاتا تھا اور اس میں طرح طرح کے حسین پھولوں وغیرہ کے ڈزائن ہوتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کے دیبادراصل "دیوباف" تھا یعنی وہ کپڑا جسے دیویا جن نے بنا ہو۔ یہ کپڑا اتنا خوبصورت ہوتا تھا کہ شروع میں اسے انسانی کاریگری کا کمال سمجھنے کے بجائے کسی جن وغیرہ کے غیر معمولی کمال کا نمونہ ہونے کا اس پر گمان ہوتا تھا۔

(۲۸)ڈوریا : ڈور دھاگے کو کہتے ہیں۔ لیکن ڈوریا میں ڈر کی تخصیص ان رنگین ڈوروں کی وجہ سے تھی جو تھان کے طول میں ایک قسم کی دھاری کا ڈزائن ڈالنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

(۲۹)ڈینم : یہ موٹا اور مضبوط کپڑا شروع میں نیلی جینس وغیرہ میں بڑا مقبول ہوا۔ اب یہ سوٹ وغیرہ کے لیے بھی استعمال ہورہا ہے ۔ اسے شروع میں نیم کا سرج (SERGE DE NIMES) کہتے تھے کیونکہ اسے سترھویں صدی میں فرانس کے مقام نیم(NIMES) میں کانوں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کے لیے نیل میں رنگ کر اوپر پہننے والی پوشاک بنانے کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔

(۳۰)ریان : یہ سب سے پہلا ایسا ریشہ ہے جسے انسان نے بنایا۔ اسے بنانے میں سب سے پہلے فرانس کے ہلیئر ی دی شاردونے (COUNT HILAIRE DE CHAR-DONNET) نے کامیابی حاصل کی تھی اور ۱۸۸۴ء میں اس کا پینٹ حاصل کیا تھا۔ شروع میں اسے مصنوعی ریشم کا نام دیا گیا ۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں RETAIL DRY-GOODS ASSOCIATION نے اس کے لیے "ریان" نام کا انتخاب کیا۔ فرانسیسی لفظ RAYON کا مطلب کرن یا شعاع ہوتا ہے۔ اس نام کے انتخاب کی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کے اس مصنوعی ریشے کی تار کو شعاع کے مماثل قرار دیا گیا اور دوسرے اس لفظ میں COTTON کی طرح آخر میں ON تھا(خود لفظ کاٹن باآخر کپاس کے لیے عربی لفظ

"قطن" تک پہنچتا ہے۔)

(۳۱)زربفت : پرانے زمانے کا ایک قیمتی کپڑا جو سونے کے تار شامل کر کے بنا جاتا تھا۔ اسے "بزر بافتہ" کے معنوں میں زربفت کہا جاتا تھا۔

(۳۲)زین : ایک قسم کا موٹا مضبوط TWILL بُناوٹ کا سوتی کپڑا جسے انگریزی میں ڈرل DRILL کہتے ہیں۔ اردو نام زین دراصل اسی کپڑے کے ایک اور نام JENE FUS-TIAN سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو مختصراً جین (JEAN) کہتے ہیں جس کی جمع آج کل نوجوانوں میں مقبول امریکی پوشاک جینس (JEANS) کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خود لفظ جین اٹلی کے شہر جے نوا (GENOA) سے نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔

(۳۳)ساٹن : یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس لفظ کی اصل عوامی لاطینی کا لفظ SETINO ہے جس کے معنی ریشم ہوتے ہیں اور جو قدیم لاطینی لفظ SETA سے نکلا ہے جس کے معنی بال یا ریشے کے تھے۔ لیکن یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ لفظ اصلاً چینی ہے۔ اور چین میں واقع ایک مقام سے تعلق رکھتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اس کا نام زیتون تحریر کیا ہے اور مارکو پولو نے اس کو زیٹن (ZAYTON) لکھا ہے۔ دوسرے لوگوں نے اس کا املا TZU-TING یا SZTUM وغیرہ تحریر کیا ہے۔ اس سے غالباً فوکی ان (FOKIEN) علاقے کا بندرگاہ چوان چاؤ مراد ہے۔ اس بندرگاہ سے یوروپی تاجر چینی کپڑے لے جاتے تھے جنھیں عربوں سے زیتونیہ اسپین کے باشندوں نے ACEY TUNI، فرانسیسی میں ZATONY اور قرون وسطی کی اطالوی زبان میں سیٹانی (ZETANI) نام دیا گیا تھا۔ انگریزی میں پہلے اسے ZETIN کہا جاتا تھا جس نے بالآخر SATIN کی شکل اختیار کی ہندستان پہنچنے پر یہ لفظ ساٹن (ٹے پر زبر کے ساتھ) یا ساٹھن ہو گیا۔

(۳۴)سرج : ایک قسم کا مصنوعی ٹوئل (TWILL) بُناوٹ کا اونی کپڑا۔ ابتداءً یہ نام ریشمی کپڑے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ یہ نام ایک لاطینی لفظ SERES سے نکلا تھا۔ یہ نام مشرقی ایشیا کی کسی ایسی قوم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جس نے سب سے پہلے ریشم کا استعمال شروع کیا تھا۔ قیاس کیا جاتا تھا کہ اس سے چینی لوگ مراد تھے۔

(۳۵)سوسی : سید سلیمان ندوی یاقوت حموی کی تصنیف معجم البلدان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شمالی افریقہ میں ایک مقام سوسہ تھا جو کہ ساتویں صدی ہجری کے آس

پاس پارچہ بافی کا بڑا مرکز تھا اور یہاں بیش قیمت کپڑا بنا جاتا تھا جس کے ایک تھان کی قیمت دس دینار تک تھی۔ ہنری یول نے اپنی تصنیف ہابن جابسن (HOBSON- JOB-SON) میں سوسہ کو بابل کا شہر شوشن (SHUSHAN) سے منسلک کیا ہے جس کا ذکر بائبل میں ملتا ہے۔ اور جو بابل سے ہونے والی کپڑوں کی تجارت کا مرکز تھا لیکن جب کہ ساتویں صدی کے ہجری میں مقبول سوسہ کے کپڑے کی شہرت ہندستان پہنچنے اور اس کے نام کو معیار کی ضمانت کے طور پر یہاں کے کسی قسم کے کپڑے کے ساتھ وابستہ ہونے کے امکانات ہیں۔ حضرت دانیال کے زمانے کے یعنی دور قبل از مسیح کے سوسہ کی شہرت کا ہندستان پہنچ کر اتنے طویل عرصے تک بر قرار رہنا ممکن نظر نہیں آتا۔ سوسی بہر حال ہندستان میں کوئی بڑا قیمتی کپڑا نہیں رہا۔ بلکہ وہ ایک ایسا کپڑا تھا جو عوام کی دسترس میں تھا۔ یہ نام ریشم اور سوت کے ایک ملے جلے دھاری دار کپڑے کو دیا جاتا تھا جو خاص طور پر پنجاب میں عورتوں کے پائجامے کے لیے مقبول تھا۔ دھاریوں کے اعتبار سے اسے دو خانی یا تین خانی بھی کہا جاتا تھا۔ بٹالہ اور فرید کوٹ اس کپڑے کے اہم مراکز تھے۔

(۱۰۲) شفون : یہ انگریزی نام شفان (CHIFFON) کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس باریک کپڑے کے لیے جو کہ ۱۸۹۰ء کے قریب رواج میں آیا فرانسیسی سے نام مستعار لیا گیا جس میں CHIFFON کا مطلب چندی یا چھیتھڑا ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں اسے باریک کپڑے کی وہ دھجیاں مراد لی جانے لگی جو عورتوں کے لباس میں آرائش کے لیے جھالروں وغیرہ کی شکل میں لگائی جاتی تھیں۔ اسی سے اس باریک نفیس کپڑے کا نام نکلا۔

(۳۷) سین فواؤ : کپڑے کو سکڑنے سے بچانے کا یہ طریقہ اس کے امریکی موجد سینفرڈ ایل کلیوٹ (SANFORD L. CLUETTE) کے نام پر رائج ہے۔

(۳۸) شنیل : اس روئیں دار اونی یا ریشمی کپڑے کا نام فرانسیسی سے لیا گیا ہے جہاں CHENILLE کا مطلب کملا کیڑا یعنی CATERPILLAR ہوتا ہے۔ کملا کیڑے کے جسم پر بھی بڑے بڑے روئیں ہوتے ہیں۔ اور یہ کپڑا بھی اس سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس فرانسیسی لفظ کی اصل لاطینی لفظ CANICULA ہے جس کے معنی چھوٹے سے کتے یا کتے کے پلے کے ہوتے ہیں۔ (انگریزی لفظ CATERPILLAR اقدیم فرانسیسی کے ایک لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی بڑے بالوں والی بلی کے ہوتے ہیں۔)

(۳۹) شیر شکر : ہنری یول نے اس کو SEER SUCKER لکھ کر اسے سر اور "سکھ" سے متعلق کرتے ہوئے یہ معنی دیے ہیں کہ جو سر کو آرام دے۔ شیر و شکر ایک قسم کا خوبصورت ریشمی کپڑا تھا جو یوروپ کے تاجر ہندستان سے لے جاتے تھے ابتداءً یہ ایک سوتی کپڑا ہوتا تھا جس کی بناوٹ میں بلبلے ڈالے جاتے تھے۔ اس سے کپڑے کی سطح جگہ جگہ ابھر آتی ہے اور خوبصورت لگتی تھی۔ لیکن چند دھلائیوں کے بعد وہ بیٹھنے لگتے تھے اور اگر استری کردی جائے تو بالکل دب جاتے تھے۔ بعد میں اس کپڑے میں بیچ بیچ میں سکڑنے والے دھاگوں کی دھاریاں ڈالی جاتی تھیں جس سے کچھ دھاریوں میں کپڑا ہموار رہتا اور کچھ میں سمٹ جانے کی وجہ سے خوبصورتی شکنیں پڑ جاتی تھیں۔ کپڑے کی شکل میں اس طرح دو کیفیات ظاہر ہونے کو اس کے نام شیر و شکر سے ظاہر کیا گیا تھا جو دوسری جانب دودھ اور شکر کی ایک دوسرے میں پوری طرح حل ہو جانے کی کیفیت کی طرف اشارہ کر کے کپڑے کی مکمل خوبصورتی کو واضح کرتا ہے۔

(۴۰) فلالین : یہ انگریزی لفظ FLANNEL کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس انگریزی لفظ کی اصل کے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کی ابتداء یا تو قدیم فرانسیسی لفظ FLAIN سے ہوئی ہے جس کا مطلب کمبل ہوتا ہے یا ویلز کی زبان کے لفظ GNALA-NEN اور GWLAN سے جس کا مطلب اون ہوتا ہے۔ شروع میں فلالین ایک ڈھیلی بناوٹ کا اونی کپڑا ہوتا تھا جسے عام طور پر اندر پہننے والے کپڑوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اب سوتی فالین بھی تیار ہوتا ہے۔

(۴۱) کاڈرائے : یہ بتایا جاتا ہے کہ انگریزی لفظ CORDUROY فرانسیسی فقرے CORD DU ROY کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کے معنی بادشاہوں کا کپڑا ہے۔ خیال ہے کہ ابتداءً یہ ایک ریشمی کپڑا ہوتا تھا اور اسے فرانسیسی بادشاہ شکار کے دوران پہنتے تھے۔ بعد میں اسے خدام کی وردی کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ لیکن اب یہ ایک کھردرا موٹا ابھری ہوئی دھاریوں والا اور کافی چلنے والا ایسا سوتی کپڑا ہے جو عام استعمال میں آتا ہے۔ آکسفرڈ ڈکشنری فرانسیسی فقرے کو قیاسی قرار دیتی ہے اور یہ امکان ظاہر کرتی ہے کہ یہ نام انگریزی خاندانی نام CORDEROY سے بھی تعلق رکھ سکتا ہے۔

(۴۲) کتاں : ایک قسم کا نہایت باریک کپڑا جس کے ساتھ طرح طرح کی خوش

فہمیاں اور شاعرانہ روایات وابستہ ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ گھاس سے تیار کیا جاتا ہے اور اسے پہنا جائے تو یہ جسم کی رطوبت اور پسینہ کو جذب کرتا ہے چنانچہ اگر کوئی موٹا آدمی دبلا ہونا چاہے تو جاڑے کے موسم میں کتاں کا کورا کپڑا پہنے اور گرمی میں دھلا ہوا اور اگر دبلا نہ ہونا' چاہے تو اس کے بر خلاف کرے۔ فرہنگ آنند راج میں بتایا گیا ہے کہ بعض مقامات پر کتاں یعنی السی کے پودے پر سے چھال نکال کر ریشہ ریشہ کی جاتی ہے اور اسے ریشم کی طرح دھاگا بنایا جاتا ہے اور کپڑا بُنا جاتا ہے جسے کتاں کہتے ہیں (اس کا تلفظ تے پر زبر اور تشدید دونوں طرح ہے) یہ کپڑا نہایت نفیس اور نازک ہوتا ہے اس کی نزاکت کے بارے میں شعراء نے اپنے اشعار میں یہاں تک کہا ہے اگر کتاں پر چاند کی روشنی پڑ جائے تو وہ شق ہو جاتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اس کو آزمایا انھوں نے اسے غلط پایا پودوں سے حاصل کیے گئے ریشوں سے بنایا گیا کپڑا بہر حال پرانے زمانے میں انہی نفاست اور قیمت کی وجہ سے خاص کشش رکھتا تھا۔ انگریزی تحریرات میں گراس کلا تھ (GRASS CLOTH) کے نام سے اس کا حوالہ سولھویں صدی سے ملتا ہے۔ یہ کپڑا عام طور پر چین سے آتا تھا جہاں اسے سیاپو (SIA-PU) یعنی "گرمی کا کپڑا" کہتے تھے۔ سولھویں صدی کے سیاحوں نے اس قسم کے کپڑے کی اڑیسہ اور بنگال سے بر آمد کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۴۳) کریپ: ایک قسم کا باریک ریشمی شکن دار کپڑا۔ اسکی اصل لاطینی لفظ CRISPA ہے جس کے معنی گھونگریالے یا لہر دار کے ہیں۔ انگریزی میں اسے CRAPE لکھا جاتا ہے اور اس سے وہ کالا باریک کپڑا مراد لیتے ہیں جو ماتمی لباس میں استعمال ہوتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں CRAPE ایک قسم کے باریک اونی کپڑے کے لیے بولا جانے لگا جس کو پادریوں کا لباس تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں جب کالے ماتمی رنگ کے کریپ کے علاوہ دوسرے رنگ کے کپڑے بھی مقبول ہوئے تو ان کے لیے فرانسیسی لفظ CREPE اختیار کیا گیا۔ اب کریپ کی کئی قسمیں رائج ہیں جن میں کریپ جارجٹ شامل ہے جس کو صرف جارجٹ بھی کہا جاتا ہے۔

(۴۴) کمخواب: سنہری تاروں والے اس روایتی بروکیڈ کے نام کی ابتداء معنی اور تلفظ و املا کے بارے میں کافی اختلاف ہے۔ یہ کمخا' کمخاب اور کمخواب کی شکل میں لکھا اور کاف پر زبر اور زیر کے ساتھ بولا جاتا رہا ہے۔ کم اور خواب کے الفاظ کو مد نظر رکھتے ہوئے بعض

لوگ اسے یہ معنی لیتے ہیں کہ ایک ایسا ریشمی کپڑا ہے جس سے نیند کم آتی ہے اور اس کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ اس میں استعمال ہونے والے اون یا ریشم کے ریشے ایسے لمبے سخت اور کھردرے ہوتے ہیں کہ وہ سونے نہیں دیتے۔ یوسف علی کم خواب کے معنی یہ لیتے ہیں کہ جس نے اس کپڑے کو نہیں دیکھا وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا (یعنی اسے خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا)۔ اس کے برخلاف فرہنگ آنند راج میں رشیدی کے حوالے سے درج کیا گیا ہے یہ کم خاب ہے اور خاب کا مطلب رواں ہوتا ہے یعنی اس کپڑے میں رواں کم ہوتا ہے۔ فارسی میں اسے کمخا بھی لکھا جاتا ہے جو کہ کمخاب کا مخفف ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ KINCOB کی شکل میں ملتا ہے اور یورپ میں غالباً تیرھویں صدی میں رائج ہوا۔ ڈوزی نے باف مین کی سند پر یہ بتایا ہے کہ اس کی اصل چینی لفظ "کن۔ خا" ہے اور "کن" کا مطلب سونا (سونے کی دھات) ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ قرین قیاس ہے کہ یہ لفظ چین سے کن خا کی شکل میں چلا۔ ایران وغیرہ دوسرے ممالک نے اس کو کم خا کی شکل میں اختیار کیا۔ ایران میں اسے پہلے کم خاب کی شکل دی اور پھر لفظ خواب سے مماثلت نے اسے کمخواب بنادیا۔

(۴۵) کے لیکو (کالیکو): یہ سادہ سوتی کپڑا سولھویں سترھویں صدی کو یورپ سے ہندستان کے مغربی ساحل سے برآمد ہوتا رہا۔ مغربی ساحل پر گوا کے بعد سب سے اہم بندرگاہ کالی کٹ تھا (کیرالا کے اس شہر کا نام اب پھر سے کوزی کوڈ کر دیا گیا ہے) جسے فرانسیسی CALICOT لکھتے اور فرانسیسی زبان کے تلفظ کے قاعدے سے آخری حرف کو چھوڑ کر اسے کالیکو پڑھتے تھے۔ انگریزوں نے اس لفظ کو تلفظ کے اعتبار سے اختیار کیا حالانکہ سترھویں صدی میں بعض تحریرات میں اس کپڑے کے لیے کالی کٹ کا لفظ بھی ملتا ہے لیکن اسے لکھنے والوں کی صحت پسندی کے رجحان کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ بعض ڈکشنریاں یہ بتاتی ہیں کہ یہ کپڑا کالی کٹ میں بنتا تھا لیکن حقیقت ہے کہ کپڑا مغربی اور جنوبی ہندستان کے مختلف مراکز پر بنتا تھا اور کالی کٹ کے بندرگاہ سے یورپ کو برآمد کیا جاتا تھا۔

(۴۶) کیمرک: اس کپڑے کو فرانس کے شہر CAMBRAI میں بنائے جانے کی وجہ اس کو CAMBRIC کہا گیا۔ لیکن تاریخی اعتبار سے اس کپڑے کو سب سے پہلے فلینڈرس کے شہر KAMERYK میں بنانا شروع کیا گیا۔

(۴۷) کینوس : ایک قسم کا موٹا کپڑا جو بادبانوں ، خیموں اور جوتوں وغیرہ کے بنانے میں کام آتا ہے۔ اس لفظ کی لاطینی CANABIS اور یونانی KANNABIS ہے جس کا مطلب سن کا پودہ ہوتا ہے۔ اس قسم کا سخت اور کھردرا کپڑا شروع میں سن کے ریشے سے بنایا جاتا تھا۔

(۴۸) گاچ : بہت ہی ڈھیلی بُنائی کا جالی جیسا ہلکا کپڑا جیسا اکثر زخموں کی مرہم پٹی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ انگریزی لفظ GAUZE کی شکل ہے جو کہ کہا جاتا ہے فلسطینی شہر غزہ سے اس کی نسبت کو بتاتا ہے۔

(۴۹) گاڑھا : ایک قسم کا موٹا معمولی طرح سے بنایا ہوا سوتی کپڑا جو سستا ہوتا تھا اور جسے غریب لوگ استعمال کرتے تھے۔ اس کو گاڑھا دبیز ہونے کی وجہ سے کہا گیا اور اس طرح ململ کی نرمی اور نفاست کے مقابلے میں تضاد پیدا کیا گیا۔

(۵۰) گبرون : ایک قسم کا ٹوئل کپڑا جو استر وغیرہ لگانے کا کام آتا ہے۔ اسے غالباً خلیج فارس پر واقع شہر GAMBROON کی مناسبت سے یہ نام دیا گیا۔ ہندستان میں یہ کپڑا لدھیانہ کلاتھ کے نام سے بھی معروف تھا۔

(۵۱) گزی : بہت موٹا دیسی گاڑھا۔ دراصل یہ فارسی لفظ "گبز" سے گبزی" تھا جو عام استعمال میں گزی ہو گیا۔ "گبز" کے معنی موٹا اور دبیز ہوتے ہیں۔ اس نے عربی میں غفص کی شکل اختیار کی اور وہ بگڑ کر اردو میں گف ہو گیا جس کا مطلب دبیز اور موٹا لیا جاتا ہے اور جو بالخصوص کپڑے کے موٹا ہونے کے بارے میں بولا جاتا ہے۔

(۵۲) گمٹی : ایک قسم کی موٹی چادر جس میں ابھری ہوئی دھاریاں اور بیل بوٹے ہوتے ہیں۔ یہ انگریزی لفظ DIMITY کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ خود یہ لفظ یونانی کے دو لفظوں DIS یعنی دو اور MTOS (یعنی تانا۔ وہ دھاگا جو کپڑے کے طول میں ڈالا گیا ہے) سے بنا ہے اور اس طرح یہ ہندستانی لفظ "دوسوتی" جیسے معنی رکھتا ہے۔

(۵۳) لٹھا : انگریزی لفظ LONG CLOTH ۔ ہندستان میں لانگ کلاتھ ' لانگ کلوث وغیرہ شکلوں میں رائج ہوا اور بالآخر اس نے "لٹھا" کی مختصر شکل اختیار کر لی۔ اس لفظ کو انگریزوں نے شروع میں ایک قسم کے کپڑے کے لیے استعمال کیا تھا جو ہندستان سے انگلستان بر آمد کیا جاتا تھا۔ ہندستان سے بر آمد کئے جانے والے دو قسم کے کپڑے

ہوتے تھے ایک تو ململ وغیرہ کے چھوٹے ٹکڑے جنھیں فارسی اصطلاح پارچہ جات کی بنیاد پر PIECE GOODS کہا جاتا تھا اور دوسرے ایسے کپڑے جن کا طول مروج لمبائی سے زیادہ ہوتا تھا۔ انھیں لانگ کلاتھ کا نام دیا گیا۔ لیکن ہندستان سے تجارت کے متعلق بعض تحریرات اور بعض دوسرے بیانات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے لانگ کلاتھ کا لفظ لنگی یا لنگی جیسے کپڑے کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ بعد میں جب انگلستان کی ملوں میں بنے ہوئے تھان جب ہندستان بر آمد کئے گئے تو انگریزوں نے ان کو بھی لانگ کلاتھ کا نام دیا۔ اور خاص طور پر لنکا شائر 'مانچسٹر اور گلاسکو سے آنے والے سفید شرٹنگ کو ہندستانی لانگ کلوث یا لٹھا کہنے لگے۔

(۵۴) مارکین : ایک قسم کا انگلستان سے بن کر آنے والا چکنا موٹا کپڑا جو میز کرسیوں کو چھپانے کا کام آتا تھا۔ یہ امریکن کلاتھ تھا جس سے بگڑ کر وہ مارکین ہو گیا۔

(۵۵) مخمل : مخمل کا تعلق عربی لفظ خمل سے ہے جس کا مطلب کپڑے کا رواں ہوتا ہے۔اور مخمل روئیں دار کپڑے کو کہتے ہیں۔ اردو میں یہ ململ کے وزن پر مخمل ہو گیا ہے۔ انگریزی لفظ VELVET بھی لاطینی لفظ VILLUS تک پہنچتا ہے جس کے معنی جانور کے لٹکنے والے بال ہوتے ہیں اور کیونکہ مخمل پر بھی گھنا رواں ہوتا ہے اس لیے اس کے واسطے یہ نام اختیار کیا گیا۔

(۵۶) مرسرائزڈ : سوتی کپڑے کو ریشمی کپڑے جیسی چمک نرمی اور پختگی دینے کے لیے کاسٹک پوٹاش یا کاسٹک سوڈا وغیرہ میں سوت کو ڈبونے کے اس طریقے کی ۱۸۴۴ء جان مرسر (JOHN MERCER) نے ایجاد کی تھی جس کا زمانۂ حیات ۱۷۹۱ء سے ۱۸۶۶ء کا تھا۔ انگلستان کے شہر ACC RINGTON کے اسی کے لیکو چھپائی کرنے والے اور کیمسٹ کے نام پر اس طریقے کو مرسرائزڈ (MERCERISED) کہا گیا۔ انگریزی میں MERCER کا لفظ علاحدہ بھی مستعمل ہے اور اس سے سوتی ریشمی کپڑوں کا تاجر مراد لیا جاتا ہے۔

(۵۷) مشجر : وہ کپڑا جس پر بیل بوٹے بنے ہوں۔ عربی میں "شجر" کا لفظ درخت کے لیے آتا ہے اور مشجر سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس پر درخت جیسے گل بوٹے اور شاخ اور پتے وغیرہ بنائے گئے ہوں۔

(۵۸) مشروع : یہ ایک عربی کا لفظ ہے جس کا مفہوم ہے وہ جو شرع کے مطابق ہو۔ مشروع میں ریشم کے ساتھ سوت بھی شامل کیا جاتا ہے اس لیے اسے مرد پہن سکتے ہیں اور اس سے نماز ہو سکتی ہے جب کہ خالص ریشم کے کپڑے مردوں کے لیے جائز نہیں ہیں۔

(۵۹) ململ : پلیٹس نے اس لفظ کی اصل سنسکرت لفظ مُردو بتائی ہے جس کے معنی بہت ملائم کے ہیں۔ ہندی میں خیال پر زور دینے کے لیے اکثر لفظ کی تکرار کی جاتی ہے چنانچہ اس کپڑے کو مردمُرد کہا گیا ہوگا جو کثرت استعمال سے ململ بن گیا اور جس کے معنی ایسا کپڑا سمجھے جانے لگے جو اتنا مہین ہو کہ اسے بار بار ہاتھ سے ملنے پر اس کو محسوس کیا جا سکے۔ انگریزی میں اس کے لیے لفظ مسلِن (MUSLIN) بولا جاتا ہے۔ جو اس کپڑے کی عراق کے شہر موصل سے نسبت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

(۶۰) ملیدہ : ایک قسم کا پشمینہ کپڑا جو مل کر ملائم کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نام فارسی مصدر مالیدن (ملنا) سے مشتق مالیدہ سے بنا ہے۔

(۶۱) ملیشیا : دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک موٹا سیاہی مائل نیالے رنگ کا ایک کپڑا رائج ہوا۔ اسے ایسے فوجیوں کی وردی کے طور پر استعمال کیا گیا تھا جو باقاعدہ فوج کے ساتھ معاون دستے کا کام کرتی تھی اور جس کو MILITIA(ملے شیا) کہتے ہیں۔ چنانچہ اس کپڑے کا نام بھی ملیشیا پڑ گیا جو ہندستان میں ملیشیا ہو گیا۔

(۶۲) نائلان : اس مصنوعی ریشے کے نام کے بارے میں عام لوگوں میں یہ نظریہ ہے کہ اس میں شامل این اور وائی(N/Y) سے نیویارک اور آخر کے لان(LON) سے لندن مراد ہے کیونکہ یہ ریشہ ان دو شہروں میں تقریباً ایک ساتھ بنایا گیا۔ لیکن یہ نظریہ اسی طرح قیاسی ہے جس طرح خبر کے لیے انگریزی لفظ NEWS کے بارے میں یہ خیال کیا ہے کہ اسے انگریزی الفاظ نارتھ (شمال) ایسٹ (مشرق) ویسٹ (مغرب) اور ساؤتھ (جنوب) کے ابتدائی حروف سے بنایا گیا ہے۔ اس مصنوعی ریشے کو امریکہ کے ہارڈورڈ یونیورسٹی کے ایک کیمسٹ WALLACE H. CAROTHERS نے ایجاد کیا تھا جسے امریکہ کی کیمیکل کمپنی DU PONT نے خرید لیا۔ کمپنی نے کمپنی میں کام کرنے والوں کو اس ریشے کے لیے ایک ایسا نام تجویز کرنے کی دعوت دی تھی جس کے آخر میں COTTON

اور RAYON کی طرح ON ہو چنانچہ ۱۹۳۸ء میں اس ریشے کو NYLON کہنا طے پایا ۔NYL کا جزو دراصل VINYL سے لیا گیا تھا جو کہ ایک ایسا مادہ ہے جو کئی مصنوعی ریشوں کی بنیاد ہے۔

(۶۳)وائل : جھلک دار کپڑے کی ایک قسم جس کا نام فرانسیسی لفظ VOILE پر مبنی ہے جس کے لغوی معنی نقاب ہیں۔

(۶۴)ورسٹڈ : لمبے اور تقریباً یکساں لمبائی کے بالوں کو بل دے کر بنائے گئے اونی دھاگے سے بنائے جانے والا یہ کپڑا WORSTED کہا جاتا ہے یہ انگلستان میں -NOR FOLK علاقے میں واقع گاؤں WORSTEAD میں شروع میں بنایا گیا اور اسی نسبت سے اس کا نام پڑا۔

کھیلوں کے لفظ، لفظوں کا کھیل

انسان نے اپنی تفریح طبع کے لیے طرح طرح کے کھیل ایجاد کیے ہیں اور ان کھیلوں کو قسم قسم کے نام دیے ہیں۔ یہ نام اور کھیلوں کی دنیا سے تعلق رکھنے والے دوسرے الفاظ کس طرح شروع ہوئے اور ہم تک کس طرح پہنچے یہ بذات خود ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور کسی کھیل سے کم نہیں۔

مثلاً مختلف ٹیموں یا کھلاڑیوں کے درمیان مقابلے کا ایک طریقہ راونڈ رابن کہلاتا ہے۔ اس طریقے کے تحت ہر ٹیم یا کھلاڑی کو مقابلے میں شامل ساری ٹیموں یا کھلاڑیوں کے ساتھ ایک ایک بار کھیلنا ضروری ہوتا ہے۔ راونڈ رابن دراصل ایک فرانسیسی فقرے کی بدلی ہوئی شکل ہے جس میں "رابن" کو ایک ایسے لفظ کی جگہ لایا گیا ہے جس کا مطلب فیتہ یا ربن ہوتا ہے۔ ابتداء میں اس کا کھیل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں جب فرانس میں جابر بادشاہوں کی حکومت تھی، بادشاہ کسی شکایت کو سننے کے لیے تیار نہیں تھے اور اگر کچھ لوگ اپنے دستخطوں سے بادشاہ کو شکایتاً عرضی دیتے تو جس شخص کے دستخط سب سے اوپر ہوتے اسے سازش کا سرغنہ قرار دے کر اسے سزائے موت دے دی جاتی۔ اسے بچنے کے لیے لوگوں نے یہ طریقہ نکالا کہ وہ کاغذ کی ایک ایسی پٹی پر دستخط کرتے جس کے سرے چپکا کر ایک حلقہ بنالیا جاتا۔ اس طرح یہ معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں رہا کہ سب سے پہلے کس نے دستخط کیے ہیں۔ کاغذ کی ایسی گول پٹی کو راونڈ رابن کہا جاتا تھا۔ اسی طرح انگریزوں کی بحری فوج میں کسی شخص پر غدر کی قیادت کے الزام سے بچنے کے لیے لوگ پہیے کی تیلیوں جیسی ترتیب میں ایک حلقے میں دستخط کیا کرتے تھے۔ اسے بھی راونڈ رابن کا نام دیا جاتا تھا۔ چنانچہ کسی بھی ایسے طریقے کو جس میں کسی

خاص فرد کو اولیت حاصل نہ ہو اور سب کا برابر حصہ رہے راونڈ رابن کہا گیا اور اسی مناسبت سے کھیلوں میں سب ہی ٹیموں یا کھلاڑیوں کو باری باری ساری دوسری ٹیموں ' کھلاڑیوں سے کھیل کھلوا کر کسی ایک ٹیم یا کھلاڑی کو فوقیت نہ دینے کے اس طریقے کے لیے بھی راؤنڈ رابن کا نام اختیار کیا گیا۔

کھیلوں کے کے مقابلے کے لیے ٹورنامنٹ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کی تاریخ قرون وسطی تک پہنچتی ہے۔ اس زمانے میں ٹورنامنٹ کی شکل خود ایک کھیل کی تھی جس میں سورما زرہ بکتر پہن کر اور گھوڑوں پر سوار ہو کر کند ہتھیاروں ' تلواروں اور لکڑی کے بھالوں یا بانسوں وغیرہ سے ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے مقابلہ کرتے اور کسی انعام یا کسی حسینہ کی نظر عنایت جیتنے کی تمنا کرتے۔ اس قسم کے مقابلے فرانس میں شروع ہوئے اور بارھویں سے چودھویں صدی کے دوران پورے یوروپ میں پھیل گئے۔ لیکن ۱۶۰۰ء تک یہ تقریباً متروک ہو گئے۔ ٹورنامنٹ کا لفظ ایک لاطینی لفظ سے بنا ہے جس کے معنی "گھمانا" ہیں یعنی گھوڑے کو اس طرح چکر دینا کہ حریف کا وار بچا جا سکے۔ "ٹور" کا لفظ آج بھی دفتر کے لوگ "دورہ" کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

کھیلوں کا مقابلہ جیتنے والوں کو اکثر ٹرافیاں دی جاتی ہیں۔ لیکن قدیم زمانے سے آج تک ٹرافی نے طرح طرح کی شکلیں بدلی ہیں۔ ٹرافی جس یونانی لفظ سے نکلا ہے اس کا مطلب دشمن کو بھگانا اور شکست دینا ہوتا ہے۔ اور شروع میں ٹرافی کا لفظ جنگ میں فتح کے لیے بنائی گئی یادگار کے واسطے آتا تھا۔ اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ دشمن سے جو سازوسامان اور ہتھیار ہاتھ لگتے تھے انھیں ایک جگہ ڈھیر کر دیا جاتا تھا اور ارد گرد کے درختوں پر جھنڈے لگا کر انھیں دیوتاؤں کو چڑھاوے کی حیثیت دی جاتی تھی۔ پھر اس قسم کی مستقل یادگاریں بنانے کا رواج ہوا تو انھیں بھی ٹرافی کہا جانے لگا۔ بعد میں ان یادگاروں میں شامل ہتھیار وغیرہ کی تصاویر کو عمارتوں میں اندرونی آرائش کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ شکاری اپنے شکار کیے ہوئے جانوروں کے سینگوں اور سروں وغیرہ کو یادگار اور آرایش کی طور پر لگانے لگے۔ انھیں بھی ٹرافی کہا جاتا تھا۔ بعد میں کھیلوں وغیرہ کے مقابلے میں جیت کی یادگار کے طور پر جو چیز دی گئی اور اسے فخریہ طور پر لوگوں نے اپنے دیوان خانوں میں رکھنا شروع کیا اسے بھی اسی مناسبت سے ٹرافی کہنے لگے۔

کھیلوں میں ایک خاص مقابلہ آج کل جمناسٹکس کا ہوتا ہے۔ یہ ان کھیلوں سے تعلق رکھتا ہے جو جسمانی ورزش کے مختلف طریقوں سے نکلے ہیں۔ جہاں تک لفظ جمناسٹک کا تعلق ہے وہ ایک ایسے یونانی لفظ سے نکلا ہے جس کا مطلب ننگا یا عریاں ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ قدیم یونان میں لوگ جسمانی ورزش بغیر کپڑوں کے کرتے تھے کیونکہ ان یہ عقیدہ تھا کہ ننگے بدن ورزش صحت کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔ لہٰذا دوڑوں کے مقابلے میں بھی کھلاڑی بلا لباس کے شریک ہوتے تھے اور ان کھیلوں میں تماش بین کے لحاظ سے بھی عورتوں کی موجودگی ممنوع تھی۔ شروع میں یہ ورزشیں اور کھیل کھلے میدان میں ہوتے تھے بعد میں ان کے لیے خاص قسم کا سامان استعمال ہونے لگا اور وہ جگہ جہاں اس قسم کی تربیت کا انتظام ہوتا تھا اسے جمنازیم کا نام دیا گیا۔

ہندستان میں انگریزوں نے کئی مقامات پر جم خانوں کی سرپرستی کی۔ حالانکہ جم خانہ لفظ جمنازیم کا ترجمہ ہے ان عمارتوں میں جمناسٹکس وغیرہ کی سہولتیں ہی کم ہوتی تھیں، زیادہ تر کمرے کے اندر یا کورٹ پر کھیلے جانے والے کھیلوں کا انتظام ہوتا تھا۔ جم خانے سب سے پہلے غالباً بمبئی میں قائم کیے گئے اور ریکٹ کورٹ کے لیے استعمال ہونے والے لفظ "گیند خانہ" کے مثل "جم خانہ" نام رکھا گیا۔ قدیم ترین ریکارڈ ۱۸۶۱ء میں رُڑکی کے جم خانہ کا ملتا ہے۔

آج کل کھیل کے میدانوں کے ساتھ جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں ان کے ایک خاص حصے کو پویلین کہا جاتا ہے۔ لیکن شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ جس لفظ سے "پویلین" نکلا ہے اس کے معنی تتلی کے ہوتے ہیں۔ شروع میں یہ لفظ شامیانے کے لیے استعمال ہوا کیونکہ ہوا کے زور سے جھولتا ہوا شامیانہ تتلی کی طرح لگتا تھا۔ پھر یہ لفظ کسی ایسی چیز کے لیے استعمال ہونے لگا جس میں شامیانے جیسی چھت ہو جسے بڑا خیمہ یا باغ اس میں بنائی گئی سایہ دار جگہ۔ بعد میں اصل مکان سے علیحدہ کسی مختصر تعمیر کو پویلین کہا جانے لگا اور اسی اعتبار سے اسٹیڈیم کی ایک حصے کو پویلین کا نام دیا جانے لگا۔

خود کھیلوں کے عجیب رنگ ڈھنگ ہیں۔ مثلاً آپ بیڈمنٹن کے پتے پر خط لکھ سکتے ہیں کیونکہ اس سے پہلے سے کہ بیڈمنٹن نام کے کھیل کو شہرت حاصل ہو، بیڈمنٹن انگلستان کے علاقے گلوسسٹر شائر کا ایک مقام ہے جو کہ بوفرٹ کے ڈیوک کے دیہی صدر

مقام کی حیثیت سے مشہور ہے۔ جیسا کہ ہماری زندگی میں ہوتا ہے کہ بچے کو گود لینے والے کو خود بچے کے باپ کے مقابلے میں لوگ زیادہ جاننے لگتے ہیں انگلستان کے اس شہر کا نام تو اس کھیل سے دلچسپی رکھنے والوں کی زبان پر چڑھ گیا لیکن مہاراشٹر کے شہر پونے کا نام اس تعلق سے ذہن میں نہیں آتا۔ حقیقت تو یہ کہ ۱۸۷۵ء کے پاس پونے میں مقیم انگریز فوجی افسروں نے پہلے پہل اس کھیل کے اصول طے کر کے اسے کھیلنا شروع کیا۔ انگلستان لوٹنے پر ان میں بعض افسر مقام بیڈ منٹن کے قرب وجوار میں جا بسے اور انھوں نے اس کھیل کو فروغ دیا جو کہ دھیرے دھیرے انگلستان کے دوسرے ساحلی علاقوں میں کھیلا جانے لگا اور اس کے ساتھ بیڈ منٹن کا نام منسلک ہو گیا۔

بیڈ منٹن فوجیوں کے کھیل کی حیثیت سے ابھرا تو کرکٹ دراصل گڈریوں کا کھیل تھا۔ خود اس کا نام گدڑیوں کی لاٹھی کی یاد دلاتا ہے۔ کرک گڈریوں کی اس لاٹھی کو کہتے تھے جو ایک سرے پر مڑی ہوتی تھی اور بھیڑوں کو ہانکنے کے کام آتی تھی۔ اس قسم کی چھوٹی لاٹھی کو کرکٹ کہتے تھے۔ گدڑیوں نے اپنا وقت گذارنے کے لیے اپنی اس لاٹھی سے اس کھیل کو کھیلنا شروع کیا اور ۱۷۷۰ء تک کرکٹ کے بلے بجائے سیدھے ہونے کے آگے سے مڑے ہوتے تھے۔ کرکٹ کا کھلاڑی اپنے بلے سے وکٹ کو بچاتا ہے۔ دراصل وکٹ اس چھوٹے پھاٹک کو کہتے ہیں جو باڑوں میں بڑے پھاٹک کے برابر لگا دیا جاتا ہے۔ شروع میں گڈریے یہ کھیل باڑے کے چھوٹے پھاٹک کے سامنے کھڑے ہو کر کھیلتے تھے اور اسی بنا پر آج بھی کرکٹ کا کھلاڑی جن لکڑیوں سے گیند کو بچانے کی کوشش کرتا ہے انھیں وکٹ ہی کہا جاتا ہے شروع میں اس کھیل کے لیے کپڑے یا اون کے گیند استعمال ہوتی تھی جسے زمین پر لڑھکایا جاتا تھا۔ اب یہ گیند باقاعدہ پھینکی جاتی ہے اور جو گیند باز تین مسلسل گیندوں پر کسی کھلاڑی کو آوٹ کر دیتا ہے اس کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اس ہیٹ ٹرک کی ہے۔ یہ اصطلاح ابھی تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے یہ اصطلاح جادوگر کے اس کھیل سے نکلی جس میں جادوگر اپنے ہیٹ میں ہاتھ ڈال کر طرح طرح کی چیزیں برآمد کر کے لوگوں کو حیرانی میں ڈالتا ہے۔ اسی طرح کھلاڑی کی لگاتار تین بار کامیابی حیرت میں ڈالتی ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے کامیاب گیند باز کو کرکٹ کلب کی جانب سے ایک ہیٹ بطور تحفہ دیا جاتا تھا اور اسطرح یہ اصطلاح چل نکلی۔

اب تو ہیٹ ٹرک کی اصطلاح کرکٹ کے علاوہ فٹ بال اور ہاکی وغیرہ کھیلوں میں استعمال ہونے لگی ہے جہاں کسی کھلاڑی کے لگاتار تین گول کرنے کو بھی ہیٹ ٹرک کہا جاتا ہے۔ لفظ "گول" کے بنیادی معنی تو غرض ' مقصد ' یا منزل مقصود ہیں۔ لیکن کھیلوں میں اس لفظ کو سب سے پہلے گھوڑ دوڑ میں استعمال کیا گیا۔ گول اس حد کو نام دیا جاتا تھا جہاں سب سے پہلے پہنچنے پر کوئی گھوڑا دوڑ جیت لیتا تھا۔ اس مقصد کو کہ یہ مقام دور سے دیکھا جا سکے اس جگہ پر ایک بانس لگا دیا جاتا تھا جس پر جھنڈی ہوتی تھی بعد میں فٹ بال وغیرہ کھیلوں میں گیند کو پھینکنے کے لیے مقرر کی گئی جگہ کو بتانے کے لیے بانس گاڑ کر اس قسم کا نشان قائم کیا جانے لگا اور اسے بھی گول کا نام دیا گیا۔ پھر اوپر بھی ایک بانس رکھ کر گول کی اونچائی مقرر کر دی گئی اور ۱۸۹۲ء سے گول میں جالی لگنے کا بھی رواج ہو گیا۔

جہاں تک دوڑوں کے مقابلوں کا سوال ہے سب سے لمبی دوری کی دوڑ میراتھن دوڑ کہلاتی ہے جس میں کھلاڑیوں کو ۲۶ میل ۳۵۸ گز کی دوری طے کرنا ہوتا ہے دراصل میراتھن ملک یونان میں واقع ایک مقام کا نام ہے جو کہ ایتھنز کے شمال مشرق میں ۲۲ میل کی دوری پر ہے۔ ۴۹۰ قبل مسیح میں میرتھن میں یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی جس میں خلاف توقع یونانیوں کو فتح حاصل ہوئی۔ یہ خبر لے کر فےڈی پڈیز نام کا ایک ہرکارہ دوڑ پڑا اور بلا کہیں رُکے ایتھنز پہنچ کر وہ چلایا "خوشیاں مناؤ۔ ہم جیت گئے ہیں" اس کے ساتھ ہی وہ گر پڑا اور اس کی جان نکل گئی۔ میراتھن دوڑ اسی ہرکارے کی یاد تازہ کرنے کے لیے دوڑی جاتی ہے۔ ۱۸۹۶ء میں اولمپک کھیلوں کے دوبارہ شروع کیے جانے پر میراتھن دوڑ کو بین اقوامی مقابلوں میں شامل کیا گیا۔ لیکن اس وقت اس کی دوری طے نہیں تھی۔ ۱۹۰۸ء میں اولمپک کھیل لندن میں ہوئے اور میراتھن دوڑ ونڈسر قلعے سے وائٹ سٹی اسٹیڈیم تک رکھی گئی جو ۲۶ میل سے تھوڑی زیادہ ہوتی تھی۔ اس میں ۳۸۵ گز کا اضافہ اس وجہ سے کیا گیا کہ دوڑ اسٹیڈیم میں برطانوی شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی سیٹ کے ٹھیک سامنے ختم ہو۔ بعد میں ۲۶ میل ۳۸۵ گز کی یہی دوری میرتھن کی باضابطہ دوری قرار دے دی گئی۔

پچھلے دنوں میں جوڈو اور کراٹے نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ "کراٹے" دراصل جاپانی زبان کے دو الفاظ "کرا" اور "ٹے" سے مل کر بنا ہے جس مطلب "خالی

ہاتھ" ہوتا ہے۔ یہاں "خالی" سے مراد "بغیر کسی ہتھیار کے" ہے۔ دراصل ان فن کو اس بُدھ بھکشوؤں نے ایجاد کیا تھا جو دور دراز علاقوں میں اپنی خانقاہوں میں رہا کرتے تھے لیکن بعض اوقات انھیں حملہ آور ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ بُدھ بھکشو کیونکہ اہنسا کے پابند تھے اس لیے کسی قسم کا ہتھیار رکھنا یا اس استعمال کرنا ان کے لیے ممنوع تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے بچاؤ کے لیے اس قسم کے طریقے اختیار کیے جس میں صرف خالی ہاتھ یا پیروں، جسم کی طاقت اور حملے کی شدت سے ہی مخالف کو زیر کیا جا سکے۔

جوڈو بھی ایک جاپانی لفظ ہے جس معنی "نرم طریقہ" ہوتے ہیں۔ یہ دراصل جاپان کے قومی کھیل "جوجت سو" کی ہی ایک شکل ہے "جوجت سو" کشتی کا ایک ترقی یافتہ فن ہے جس کے بڑے آداب ہوتے ہیں انیسویں صدی میں ڈاکٹر کانو نے اس کشتی کا ایک نیا طریقہ نکالا جو کہ "جوجت سو" سے کم خطرناک اور پیچیدہ ہے لیکن زیادہ مؤثر تھا۔ اس میں زیادہ پھرتی کے ساتھ مقابل کو زیر کرنے کے لیے زیادہ بھرپور داؤ کی گنجائش تھی اسی بنا پر اس کو "نرم طریقہ" کہا گیا۔

سانپ سیڑھی کا کھیل موجودہ شکل میں ہمارے یہاں انگلستان سے آیا ہے جہاں اس کا قدیم ترین ذکر ۱۸۹۲ء میں ملتا ہے۔ گویا اس کھیل کی ایجاد کو ابھی سو سال سے زیادہ نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کھیل صدیوں پُرانا ہے اور اس کی ایجاد ہندستان میں ہوئی تھی۔ فرق یہ ہے کہ اب اس کھیل کے لیے خانوں میں ایک سے سو تک عدد لکھے ہوتے ہیں، لیکن قدیم ہندستانی خانقاہوں میں جب یہ کھیل رائج کیا گیا تھا اس وقت ان خانوں میں مختلف قسم کی نیکیوں اور گناہوں کے نام درج ہوتے تھے اور سیڑھیوں اور سانپوں کی لمبائی چھوٹی بڑی نیکیوں اور چھوٹے بڑے گناہوں کی مناسبت سے مقرر کی گئی تھی اور اس طرح یہ کھیل بھی اخلاقی تعلیم کا ایک ذریعہ تھا۔

تاش کا کھیل بھی صدیوں پُرانا ہے اور اس کی ابتداء بھی غالباً ہندستان یا چین میں ہوئی تھی لیکن اس وقت جس قسم کے تاش کے پتے رائج ہیں وہ یوروپ میں رائج تاشوں کے مطابق ہیں یوروپ میں چھاپے کی ایجاد کے بعد پندرھویں صدی کے آخر تک تاشوں پر دکھائی جانے والی شکلوں میں بڑی حد تک یکسانیت پیدا ہوئی۔ ہندستان میں ان چار شکلوں کو اینٹ، پان، حکم اور چڑی کا نام دیا گیا۔ اینٹ اور پان تو شکلوں کے مطابق ہیں لیکن

حکم اور چڑی غور طلب ہیں۔ دراصل حکم کا نام ہندستان میں رائج گنجفے کے کھیل سے لیا گیا ہے جس میں سب سے پہلے پھینکے جانے والے پتے کو حکم کہا جاتا تھا چڑی کے بارے میں ایک رائے یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ یہ ڈچ زبان میں اس پتے کے لیے رائج لفظ "چڑتن" سے ماخوذ ہے۔ لیکن ہندستانی زبانوں میں ڈچ زبان کے براہ راست اثر کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ یہ نام ترجمے کے ذریعے پہنچا ہو۔ اس قسم کے پتے کے لیے پرتگالی، اسپینی اور اطالوی زبانوں میں جو لفظ استعمال ہوتا ہے اس کے معنی "چھڑی" ہوتے ہیں (خود انگریزی لفظ "کلب" بھی اس سے قریب ہے) لہٰذا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پرتگالیوں کے لفظ کا ترجمہ چھڑی اختیار کیا گیا جس نے بعد میں چڑی کی شکل لے لی۔ تاش کے کھیل میں ترپ کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ یوں تو یہ لفظ انگریزی لفظ "ٹرائمف" کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب فتح ہوتا ہے لیکن دراصل یہ ایک پرانے لاطینی لفظ سے ربط رکھتا ہے جو رومن کمانڈروں کے فاتحانہ جلوس کو بتانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ رومن کمانڈر جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد دار السلطنت میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ پوری فوج زرق برق لباس میں ہوتی تھی اور ان کے پیچھے پیچھے مال غنیمت اور جنگی قیدی ہوتے تھے۔ ترپ کا پتہ بھی اسی دبدبے کے ساتھ دوسرے پتوں کو قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔

آخر میں "ہپ ہپ ہرّے" کے اس نعرے کا ذکر کریں جو فتح مند کھلاڑی اپنی فتح کی خوشی میں لگاتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ نعرہ انگریزوں کے ساتھ پہنچا اور انگریزی زبان میں مروّج امثال اور فقروں کی بریور کی ڈکشنری یہ بتاتی ہے کہ یہ نعرہ جرمنی سے آیا ہے اور اس زمانے کی یاد دلاتا ہے جب یوروپ اور خاص طور پر جرمنی میں یہودیوں کو ستانا اور ایذا پہنچانا ثواب سمجھا جاتا تھا۔ "ہیپ" تین جرمن لفظوں کے ابتدائی حروف سے بتایا گیا تھا جن کا مطلب تھا "یروشلم باقی نہ رہا" اور "ہرّا" کا مطلب تھا "جنت" کو۔ قرون وسطیٰ کے جرمن سورما جب یہ نعرہ لگاتے ہوئے یہودیوں کا پیچھا کرتے تھے تو ان کا مطلب ہوتا تھا "کافروں کے ہاتھ میں یروشلم نہیں رہا اور ہم جنت کے راستے پر ہیں"۔ اس طرح دراصل یہ نعرہ ایک نسلی نفرت کا اظہار تھا۔

کھیلوں سے متعلق کئی اصطلاحات اور الفاظ اس طرح اپنے پیچھے انوکھی اور دلچسپ کہانیاں رکھتے اور ان کا مطالعہ بجائے خود ان بڑی دلچسپی کا باعث ہے۔

اردو میں پرتگالی الفاظ

(الف) پرتگالی سے واضح طور پر متاثر الفاظ

یہ ایسے الفاظ ہیں جو یا تو پہلی بار اردو اور ہندی میں پرتگالی کے ذریعے داخل ہوئے یا جنھوں نے پرتگالیوں کی وجہ سے رواج پایا۔

اِسپات : فولاد کے لیے یہ لفظ ہندی میں مستعمل ہے۔ یہ پرتگالی لفظ Espada سے ماخوذ ہے جس کے معنی "تلوار" ہیں۔ خود پرتگالی میں فولاد کے لیے Aco کا لفظ آتا ہے۔

استری : کپڑوں پر پڑی شکنوں کو گرم لوہا پھیر کر برابر کرنے کو استری کرنا کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ پرتگالی لفظ ESTIRAR پر مبنی ہے جس کے معنی چوڑا کرنا یا پھیلانا ہوتے ہیں۔

آل پن : یہ پرتگالی لفظ Alfinete کی بدلی ہوئی شکل ہے ہندستان میں بولی جانے والی پرتگالی میں اکثر "ف" کے "پ" میں بدل دینے کا رجحان ہے۔ پھر انگریزی لفظ Pin سے مماثلت نے بھی اس لفظ کے تلفظ کو متاثر کیا ہے۔ حالانکہ پرتگالی لفظ کا اطلاق بالوں میں استعمال ہونے والے پن اور سیفٹی پن پر بھی ہوتا ہے۔ اردو میں آل پن کو خصوصی طور پر کاغذات وغیرہ میں لگائے جانے والے سوئی کی شکل والے پن کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

الماری : اس کی اصل پرتگالی لفظ Almario ہے جو دراصل لاطینی لفظ Armarium پر مبنی ہے جس کا مطلب ایک ایسا صندوق وغیرہ ہے جس میں ہتھیار رکھے جا سکیں۔ ہندستان میں الماری کپڑے وغیرہ رکھنے کے لیے ایسے فرنیچر کو کہا گیا ہے جس کو گرد و غبار دور رکھنے اور حفاظت کی غرض سے دروازے سے بند کیا جا سکے۔ آکسفرڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق انگریزی میں لفظ Almirah اردو کے وسیلے سے پہنچا۔

انگریز : یہ لفظ پرتگالی لفظ Ingles پر مبنی ہے جیسے ہندستانیوں نے اپنے رنگ میں ڈھال لیا اور رنگ ریز کے وزن پر انگریز بنا لیا اور عام بول چال میں انگریزی کا مذاق بنانے کے لیے

اسے انگریزی رنگ ریزی کہنے لگے۔

انناس : پرتگالیوں نے اس پھل کو ہی برازیل سے درآمد نہیں کیا بلکہ برازیل میں رائج اس کے نام Nanas کو بھی Ananas کی شکل میں اختیار کیا۔ ان ہی کے ساتھ یہ لفظ ہندستان پہنچا اور کئی ہندستانی زبانوں میں رائج ہوا۔

آیا : پرتگالی لفظ Aia نرس یا گورنس کے معنی رکھتا ہے۔ بعد میں اسے انگریزی نے اپنا لیا اور خاتون خانہ کی خاص ملازمہ کے لیے بولا جانے لگا۔

بالٹی : پرتگالی لفظ Balde ہے۔ مہاراشٹر کے بعض حصوں میں بالڈی بھی بولا جاتا ہے۔ لیکن اردو میں بالٹی کی شکل میں مستعمل ہے۔

برآمدہ : اس لفظ کی اصل کے بارے میں کافی اختلافات ہیں۔ حالانکہ سنسکرت میں ایک لفظ "وارنڈا" ملتا ہے۔ لیکن یول اور برنیل نے اپنی لغت "ہابسن جابسن" میں رائے دی ہے کہ اس لفظ کو پرتگالیوں کی وجہ سے رواج ملا۔ پرتگالی لفظ Verandah کو انگریزی نے Ve-randa کی شکل میں اپنایا۔ ان مصنفین کا خیال ہے کہ اردو میں دالان کے معنی میں لفظ برآمدہ بعد میں اختیار کیا گیا۔ "نور اللغات" میں برآمدہ کے پہلے معنی "دہلیز" درج کیے گئے ہیں۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ "برآمدہ" پہلے دوسرے معنی میں بھی مستعمل تھا۔

برما : لکڑی میں سوراخ کرنے والے اس آلے کا نام پرتگالی لفظ Verumma سے لیا گیا ہے۔

بمبا : حالانکہ بعض خیر خواہ اسے عربی لفظ "منبع" کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیتے ہیں۔ یہ پرتگالی لفظ Bomba پر مبنی ہے جس کے معنی "پمپ" کے ہیں۔

پادری : پرتگالی اور سپانوی زبانوں میں Padre کے اصل معنی "باپ" کے ہوتے ہیں اور مذہبی رہنما کے باپ سے تعبیر کرنا مسیحیت کا قدیم رواج ہے چنانچہ لفظ "پوپ" کا مطلب بھی باپ ہی ہوتا ہے۔ ہندستان میں پادری کا لفظ پرتگالی کے ساتھ پہنچا اور سولھویں صدی میں یہاں پھیلا۔ پرتگالی لوگ رومن کیتھولک فرقوں کے راہبوں کو پادری کہتے ہیں لیکن ہندستان میں یہ لفظ ہر درجے اور ہر فرقے کے عیسائی مذہبی پیشواؤں کے لیے بولا جانے لگا یہاں تک کہ یول اور برنیل کے مطابق شروع اٹھارھویں صدی میں مدراس کے پروٹسٹنٹ فرقے کے مذہبی رہنماؤں کو بھی پادری کہا جاتا تھا۔

پاؤ : پرتگالی میں تنور میں پکائی گئی خمیر والی پھولی ہوئی روٹی کو Pao کہتے ہیں۔ ہندستان کے بعض حصوں میں اسے نان پاؤ یا نان روٹی کہتے ہیں اس میں نان اور روٹی کے الفاظ زائد ہیں۔

پپیتا : یہ پھل ویسٹ انڈیز میں نئی دنیا کی دریافت کے ساتھ دریافت ہوا۔ اس کا مقامی نام Ababai تھا جس کی بنیاد پر سپانوی میں اسے Papaya کہا گیا۔ یہ پھل اور اس کا نام پرتگالیوں کے ساتھ ہندستان پہنچا اور ہندستان کی متعدد زبانوں میں جزوی تبدیلی کے ساتھ رائج ہوا۔

پرات : پرتگالی میں لفظ Prata کے معنی چاندی اور Prato کے رکابی کے ہوتے ہیں۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ شروع میں Prato چاندی کی رکابی کو کہتے تھے۔ بعد میں یہ لفظ رکابی کے لیے عام ہو گیا۔ ہندی میں اسے طباق جیسی چوڑی تھالی کے لیے اختیار کیا گیا۔

پرچ : طشتری چائے کے ساتھ استعمال ہونے والی چھوٹی پلیٹ کے لیے پہلے "پرچ" کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جو پرتگالی Pires کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

پگار : بعض علاقوں میں عام بول چال کی زبان میں پگار کا لفظ تنخواہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ پرتگالی میں Pagar کا مطلب ادا کرنا یا چکانا ہے۔

پیپا : پرتگالی لفظ Pipa کے معنی پائپ کے علاوہ ایسے ڈرم وغیرہ کے بھی ہوتے ہیں جس میں شراب یا کوئی دوسری سیال چیز رکھی جائے۔

تمباکو : ہندستان میں تمباکو پرتگالیوں کے ساتھ پہنچی اور سولھویں صدی کے شروع میں یہ خاص طور پر مغربی ہندستان میں رائج ہوئی اور پرتگالی لفظ Tabaco اردو میں تمباکو کی شکل میں شامل ہوا۔

تولیہ : حالانکہ انگریزی میں اس کے لیے Towel کا لفظ ہے اس پر اتفاق ہے کہ ہندستان میں اپنایا گیا لفظ تولیہ پرتگالی لفظ Toalha کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

ٹماٹر : حالانکہ اس سے انگریزی میں Tomato کہتے ہیں اس کی اصل پرتگالی لفظ To-mate ہے۔ یہ پھل میکسیکو میں دریافت ہوا تھا جہاں اسے Tematl کہا جاتا تھا۔

چابی : تالا کھولنے کے کام آنے والی کنجی کو پرتگالی میں Chave کہتے ہیں جسے اردو میں چابی کی شکل اختیار کیا گیا۔ بعض علاقوں میں چاوی بھی رائج ہے۔

چڑی : تاش کے پتوں کے چار رنگوں میں سے ایک چڑی یا چڑیا کہلاتا ہے۔ اودے نارائن

تواری اسے ڈچ لفظ "چر تن" سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ لیکن ہندستانی زبانوں پر ڈچ زبان کے براہ راست اثر کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ یہ امکان البتہ ہے کہ یہ نام ترجمے پر مبنی ہو۔ انگریزی میں Club کہلانے والے اس پتے کو پرتگالی میں Bastao یعنی چھڑی کہتے ہیں۔ کیونکہ یوروپ کے لوگ ہندستانی ہائے مخلوط کا واضح تلفظ نہیں کرپاتے اس لیے یہ امکان ہے انھوں نے جس طرح Bastao کے لیے لفظ "چھڑی" بولا ہو۔ان سے ان کے ہندستانی خادموں وغیرہ نے "چڑی" سمجھ کر اختیار کیا۔

سایا: پرتگالی لفظ Saia ہندستان میں بڑے پیمانے پر یورپین عورتوں کے لباس میں شامل اسکرٹ کے لیے اختیار کیا گیا۔

فرما: پرتگالی لفظ Forma کے معنی شکل کے ہوتے ہیں ہندستان میں یہ لفظ اس چیز کے لیے اختیار کیا گیا جو کسی چیز کو شکل دے۔

گملا: پرتگالی میں Gamela چوڑے گہرے برتن یا ناند کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس کو پودے لگانے کے واسطے تیار کئے گئے مٹی کے برتن کے لیے اختیار کیا گیا۔

گوبھی: پرتگالی لوگ گوبھی یا کرم کلا کو Couve اور گوبھی کے پھول کو Couve- Flor کہتے ہیں۔ ہندستان میں اس میں ترمیم کر کے گوبھی کر لیا گیا۔ مشرقی علاقوں میں کہیں کہیں اسے کوبھی یا کوبی کہتے ہیں۔ جس کے لیے ڈاکٹر بھولاناتھ تواری نے یہ جواز پیش کیا کہ مذہبی لوگ اسے پسند نہیں کرتے کہ کسی کھانے کی چیز میں لفظ "گو" یعنی گائے شامل ہو۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ اس لفظ کو اس کی پرتگالی اصل کے مطابق بولتے ہیں

مارکہ: برانڈ کے لیے پرتگالی لفظ Marca ہے جس کے اصل معنی نشان یا علامت ہیں۔

مستری: یہ پرتگالی لفظ Mestre کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس کا اصل مفہوم فورمین یا کارخانے کا نگراں ہے۔ لیکن ہندستان میں اسے کاریگر کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔ جیسے راج مستری مغربی اور جنوبی ہندستان میں ایک زمانے میں باورچی اور درزی کو بھی مستری صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔

موسمبی: موسمبی یا مسمی کہلانے والا یہ رس دار پھل پرتگالیوں نے شروع میں افریقہ کے ملک موزمبیق میں دیکھا اور اسی مناسبت سے انھوں نے اسے Laranjade Mosam-bique موزمبیقی نارنگی کا نام دیا جو ہندستان میں گھس گھسا کر موسمبی مسمی یا موسمی ہو گیا۔

میز : یہ پرتگالی لفظ Mesa ہے۔

نیلام : یہ پرتگالی لفظ Leilao سے بنا ہے۔ پہلے لیلام ہوا اور پھر اسی سے نیلام۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پرتگالی لفظ عربی "اعلان" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

فیتہ : اس کی اصل پرتگالی لفظ Fita ہے جس کے معنی ربن کے ہوتے ہیں۔

قمیص : حرف صاد کے ساتھ لفظ قمیص اردو میں عربی کے وسیلے سے پہلے موجود تھا لیکن یوروپ سے جو شرٹ آئی اس کے لیے ضاد کے ساتھ لفظ قمیض پرتگالی کے وسیلے سے آیا پرتگالی میں یہ لفظ Camisa ہے۔ جو کہ ضاد کے تلفظ کے ساتھ اردو میں رائج ہے۔

کاج : پرتگالی لفظ Casa (دکاز) گھر یا خانے کے لیے آتا ہے اسی بنا پر وہ خلا جس پر بٹن پھنسایا جاتا ہے اسے Casa de botao یعنی بٹن کا خانہ کہا گیا۔

کاجو : جنوبی امریکہ میں یہ Acajau تھا جو پرتگالیوں کے ساتھ ہندستان پہنچنے کے بعد کاجو ہو گیا۔

کمرا : پرتگالی Camera لاطینی سے آیا ہے۔ لاطینی فقرہ In Camera ان مقدموں کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے جن کی سماعت بند کمرے میں ہوتی ہے۔ فوٹو کیمرا ابھی شروع میں Camera Obsura یعنی اندھیرا کمرا تھا کیونکہ اس ایجاد کی بنیاد روشنی کے ایک چھوٹے سے سوراخ میں سے گذر کر اندھیرے کمرے میں پیدا ہونے والے عکس کا مشاہدہ بنا تھا۔

کوبرا : پرتگالی میں عام سانپ کے لیے لفظ Cobra مستعمل ہے۔ لیکن ہندستانی زبانوں اور انگریزی میں یہ صرف Cobra de Capello (یعنی پھن والے سانپ) کہلانے والے زہریلے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے۔

گرجا : مسیحی عبادت گاہ کے لیے ہندستان میں پرتگالی لفظ Igreja کی بنیاد پر لفظ گرجا رائج ہوا۔ پرتگال سے آنے والے عیسائی مشنریوں کی وجہ سے مسیحیت سے متعلق کئی دوسرے الفاظ ہندستان میں رائج ہوئے۔ جیسے پادری (Padre)، بپتسمہ (Batismo) کرستان (Cristao)، کیتھولک (Catalico) اور Jesus کے لیے یشوع وغیرہ۔

(ب) ایسے الفاظ جن کا پرتگالی ہونا مشکوک ہے

کچھ الفاظ ایسے ہیں جنھیں پرتگالی اصل کا بتایا جاتا ہے لیکن وہ انگریزی یا ہندستانی

زبانوں میں بھی موجود ہیں۔ اس لیے یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ براہ راست پرتگالی سے ہی آئے ہیں۔

باسن: ہندستان میں یہ لفظ گھر میں کام آنے والے برتن کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور پہلے سے موجود ہے۔ پرتگالی میں ایک لفظ Bacia ہے جس کا مطلب تسلا ہے۔ انگریزی میں بھی اسی معنی میں استعمال ہونے والا لفظ Basin ہے۔

بپتسمہ: پرتگالی Batismo انگریزی Baptism پرتگالی لفظ میں "پ" کی آواز نہیں، جب کہ لفظ کا آخری حصہ انگریزی کے مقابلے اردو سے زیادہ قریب ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ امکان ہے یہ لفظ ہندستان میں پہلے پرتگالی مشتریوں نے رائج کیا ہو۔

بٹن: پرتگالی Botao اور انگریزی Button۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ انگریزی سے براہ راست لیا گیا ہے لفظ "بوتام" البتہ پرتگالی لفظ کے قریب ہے۔ لیکن یہاں فرانسیسی لفظ Bouton غور طلب ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے اس خیال پر کہ بوتام بٹن کی بگڑی ہوئی شکل ہے تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں "جس زمانے میں فرانسیسی ہندستان آئے ان کی زبان سے پہلے پہلے شاید ہندستانی سپاہیوں نے بوتوں' سنا۔ بٹن بہت بعد کو انگریز لوگ لے کر آئے۔ (معارف ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۶۷)۔

بسکٹ: پرتگالی Biscoite انگریزی Biscuit

بوتل: پرتگالی Botelha انگریزی Bottle پرتگالی میں اب بوتل کے لیے Garaffa مستعمل ہے۔ (ہوسکتا ہے اس لفظ کی اصل میں کہیں عربی لفظ "ظرف" شامل ہو)

پستول: Pistola۔ انگریزی Pistol

پولس: پرتگالی policia۔ انگریزی Police

جیکٹ: پرتگالی Jaqueta۔ انگریزی Jacket

چائے: پرتگالی Cha۔ یہ لفظ اصل چینی لفظ کے مطابق ہے۔ یہ بجائے پرتگالی میں شامل ہو کر پہنچنے کے، جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک سے ہندستان کے رابطے کے نتیجے میں براہ راست بھی پہنچ سکتا ہے۔

ساگو: پرتگالی Sagu۔ انگریزی Sago صابو دانہ کے لیے یہ لفظ دراصل ملایا کی زبان کا ہے اور مشرقی ہندستان کے ملاحوں اور سمندری تاجروں کے ساتھ بھی ہندستان پہنچ سکتا ہے

سلاد : پرتگالی Salada۔ انگریزی Salad ۔

صابن : اس کی اصل پرتگالی لفظ Saboa بتائی جاتی ہے۔ لیکن اردو میں یہ عربی لفظ کی حیثیت سے پہلے سے رائج تھا۔

صوفا : پرتگالی اور انگریزی Sofa (حالانکہ اس کی اصل عربی لفظ "صُفہ" بتائی جاتی ہے)

کاربن : پرتگالی Carbina انگریزی Carbine

کافی : پرتگالی Cafe ۔ حالانکہ کافی پرتگالیوں کے ساتھ ہندستان پہنچی۔ اردو میں اس کے لیے عربی لفظ قہوہ مروج رہا۔

کپتان : پرتگالی :Capitao۔ انگریزی Captain ۔

کرسٹان : پرتگالی Cristao انگریزی Christian

کرنل : پرتگالی Coronel۔ انگریزی Colonel۔ (حالانکہ انگریزی میں بھی اس لفظ کے تلفظ میں حرف "ر" کی آواز شامل رہتی ہے)

کنستر : انگریزی میں Canister۔ اس معنی میں پرتگالی میں Caixa استعمال ہوتا ہے۔ پرتگالی Canastra کے معنی ٹوکری کے ہیں۔

کوچ :(گاڑی) پرتگالی Coche۔ انگریزی Coach

کیتھولک : پرتگالی Catolice انگریزی Catholic

گارد : پرتگالی Guarda۔ انگریزی Guard۔

گودام :اس کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ یہ دراصل ملایا کی زبان کا لفظ Gadong کی ایک شکل ہے۔ پرتگالی میں یہ لفظ Gudao ہے۔

مستول : پرتگالی Mastro انگریزی Mast لیکن یہ لفظ عربی میں "مستول" کیشکل میں موجود تھا۔ اس لیے اس کا پرتگالی سے آنا قرین قیاس نہیں ہے۔

وائلن : پرتگالی Violine۔ انگریزی Violin۔ تاریخی اعتبار سے ہندستان میں پرتگالیوں کو انگریزوں پر تقدیم حاصل ہے۔ پرتگالی تاجروں اور مذہبی مبلغوں نے انگریزوں سے پہلے ہندستانیوں کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس ربط کے نتیجے میں خاص طور مذہبی اور فوجی اہمیت کے پرتگالی الفاظ ان کے واسطے سے ہندستانی زبانوں میں داخل ہوئے۔ لیکن بعد میں جب انگریزوں نے ہندستان کے زیادہ بڑے حصے پر اقتدار

حاصل کیا تو پرتگالی اور فرانسیسی زبانوں کے مقابلے میں انگریزی کا اثر زیادہ وسیع اور دیرپا ہوا جیسا کہ لفظ "بوتام" اور "بٹن" کے سلسلے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پرتگالی یا فرانسیسی کے زیر اثر داخل ہونے لفظ "بوتام" کی جگہ بعد میں انگریزی لفظ "بٹن" نے لے لی۔

(ج) ظاہری مماثلت رکھنے والے الفاظ

اردو ہندی الفاظ کی تحقیق میں مصروف بعض ماہرین نے پرتگالی زبان سے آنے والے الفاظ کی فہرست میں بعض اوقات ان زبانوں کے ایسے الفاظ بھی شامل کر لیے ہیں جو پرتگالی الفاظ سے ظاہری مماثلت تو رکھتے ہیں لیکن ان میں معنوی مطابقت نہیں ہے۔

اچار : اسے اکثر پرتگالی الفاظ کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ فارسی اصل کا ہے اور پہلے سے اردو میں موجود تھا۔ یہ بہر حال ان الفاظ میں سے ہے جنھوں نے پرتگالی زبان میں جگہ بنائی اور پرتگالی کے واسطے سے انگریزی میں شامل ہوئے۔

بستہ : یہ لفظ فارسی مصدر "بستن" یعنی باندھنے سے مشتق ہے اس کے اردو میں داخلے میں پرتگالیوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حالانکہ پرتگالی میں ایک لفظ Boceta ہے۔ لیکن اس کے معنی خاکے یا اسکیچ کے ہیں۔

بھاپ : ڈاکٹر کیلاش چندر بھاٹیا نے اپنے تحقیقی مقالے "ہندی میں انگریزی کے آگت شبدوں کا بھاشا شاستریہ اڈھین میں پرتگالی لفظ Bufo کی جانب "بھاپ" کی اصل کی حیثیت سے نشان دہی کی ہے۔ لیکن بھاپ کا لفظ سنسکرت لفظ "واشپ" سے بنا ہے اور بھاپ بھپکا' بھپار او غیرہ الفاظ پہلے سے اردو ہندی میں مستعمل ہیں۔

بینگن : اسکے لیے ڈاکٹر بھاٹیا نے پرتگالی لفظ Berigela کا ذکر کیا ہے۔ جو کہ خود عربی لفظ برنجل سے ماخوذ ہے اور بینگن خالص ہندستانی لفظ ہے۔

جنگلا : پرتگالی Jungla جنگل کے معنی ہیں جب کہ اردو اس کے معنی حد بنانے یا روکاوٹ پیدا کرنے کے لیے ڈنڈوں بانسوں یا سلاخوں سے بنائی باڑھ یا جالی ہوتے ہیں۔

چھاپ : پرتگالی لفظ Chapa ضرور ہے۔ لیکن وہ ہندستانی لفظ "چھاپ" سے غیر متعلق ہے۔

سپاٹ : پرتگالی لفظ زپات (sapato) کا مطلب جوتا ہے۔

طنبورہ : اردو میں یہ لفظ ستار جیسے ایک ساز کا نام ہے جس میں تونبڑا لگا ہوتا ہے۔ اور شاید

اسی وجہ اس کا نام پڑا۔ پرتگال Tambor ایک قسم دف یا ڈھولک ہوتی ہے۔

طوفان : اردو نے یہ لفظ عربی سے لیا ہے اور پرتگالی کا لفظ Tufao بھی شاید اسی طرح عربی سے ماخوذ ہو۔ جیسے مانسون کے لیے پرتگالی کا لفظ عربی کے موسم سے۔

فالتو : اردو میں اس کا مفہوم فضول یا ضرورت سے زیادہ ہے جب کہ پرتگالی لفظ Falto کا مطلب جتنی ضرورت ہے اسے کمی کا ہوتا ہے۔

کردھنی : حالانکہ کمر میں باندھی جانے والی اس پٹی یا زیور کے لیے پرتگالی لفظ Cordao اور انگریزی لفظ Cordon ملتے ہیں۔ پھر بھی یہ خالص ہندستانی لفظ ہے اور پلیٹس نے اپنی ڈکشنری میں اس کی اصل (कटि + धारि + पाश) بتائی ہے۔

لبادہ : حالانکہ ڈاکٹر بھاٹیا نے اس کے لیے پرتگالی لفظ Loba تلاش کیا ہے جس کے معنی ڈھیلا گاؤن ہوتے ہیں یہ لفظ فارسی زبان میں بہت پہلے سے موجود ہے۔ "فرہنگ آنند راج" کا یہ اندراج ملاحظہ ہو۔ "بفتح اول۔ فارسی بمعنی جامۂ بارانی۔ مولوی گفتہ

دہند گنج رواں و برند رنج رواں
دہند جامہ اطلس برون برند لباد

و در عربی بمعنی نمد آمدہ"۔

لیمو : پرتگالی میں اس کے لیے لفظ Limao ہے۔ لیکن یہ لفظ عربی زبان اور علم طب کی معرفت ہندستان میں پرتگالیوں کی آمد سے پہلے معروف تھا۔

دن اور مہینے

"دِن" کا لفظ دو طرح استعمال کیا جاتا ہے۔(۱) اس وقت کے لیے جب کسی جگہ سورج نکلا ہوا ہوتا ہے اور (۲) اس کے عرصے کے لیے جو ایک بار سورج نکلنے سے دوسری بار سورج نکلنے کے درمیان پڑتا ہے۔ دوسرے مفہوم میں پہلے مفہوم کے دن اور اس کے بعد آنے والی رات دونوں شامل ہوتے ہیں۔ عربی میں البتہ رات کے لیے "لیلۃ" دن کے لیے "نہار" اور ایک دن ایک رات پر مشتمل عرصے کے لیے "یوم" کے الفاظ رائج ہیں۔ ورنہ بیشتر زبانوں میں اردو کے لفظ "دن" کی طرح ایک ہی لفظ سے دونوں مفہوم لیے جاتے ہیں۔

جب وقت اور دنوں کا حساب زیادہ باریکی سے رکھا جانے لگا تو یہ طے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دن کے کس وقت سے تاریخ کا شروع ہونا مانا جائے۔ یونان اور بابل کے لوگ طلوع آفتاب سے مصری، آدھی رات سے 'وسط ایشیا کے لوگ دوپہر سے اور مغربی ایشیا کے لوگ غروب آفتاب سے دن کی ابتدا مانتے تھے۔ کیونکہ اسلام نے قمری بنیاد پر تاریخوں کے حساب کو برقرار رکھا ہے اس لیے رویت ہلال کے ساتھ ساتھ نئے مہینے کی نئی تاریخ تسلیم کرنے کی روایت جاری رہی اور پرانی تاریخ غروب آفتاب کے ساتھ ختم ہونے کا سلسلہ برقرار رہا۔

ہندستان میں جیوتش کے علم کو فروغ ہوا اور نکشتروں اور تتھیوں کے نظام کی تفصیلات طے ہوئیں اور اسی بنیاد پر کس دن تاریخ کی ابتداء کہاں سے مانی جائے اس کے اصول بھی مقرر کیے گئے۔ لیکن اس کے نتیجے میں تاریخ کی ابتداء کا اندازہ مظاہر فطرت کی بجائے جنتری کی مدد سے کیا جانے لگا۔ دوسری جانب علم ہیئت کا مطالعہ کرنے والوں نے ایک شب وروز کو کرۂ ارض کے اپنی دھری پر ایک چکر پورا کر لینے کے برابر مانا جس میں ان

تحقیقات کے مطابق زمین کو ۲۳ گھنٹے ۵۶ منٹ اور ۴.۰۹۹۶ سیکنڈ کا وقفہ لگتا ہے۔ جو کہ موٹے طور پر شب وروز کے روایتی طول یعنی ۲۴ گھنٹے کے برابر ہے۔ مغربی ماہرین نے قدیم مصری روایت کے مطابق آدھی رات سے نئی تاریخ کی ابتداء کو برقرار رکھا اور اب جی ایم ٹی (G.M.T) یعنی گرینچ اوسط وقت کو عالمی وقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیے جانے کے بعد رات کے بارہ بجے سے تاریخ شروع ہونے کے اصول نے عام قبولیت حاصل کر لی ہے۔

ہفتہ، جیسا کہ ظاہر ہے۔ فارسی لفظ ہفت (یعنی سات) سے نکلا ہے کیونکہ ہفتے میں سات دن شامل ہوتے ہیں۔ ہندی لفظ سپتاہ میں بھی یہی معنوی خصوصیت ہے کیونکہ سنسکرت میں ''سپت'' کے معنی سات ہوتے ہیں۔ پُرانی دنیا کی تقریباً سب ہی حصوں میں سات دن کے ہفتے کا تصور ہزاروں سال سے قائم ہے۔ اس کی دو خاص بنیادیں ہیں۔ ایک تو بابلی تصور جس میں چھ کے عدد کو خاص اہمیت حاصل تھی کیونکہ ایک تو چھ ایک ایسا عدد ہے جس کا آدھا بھی کیا جاسکتا ہے اور تین حصے بھی۔ اس لحاظ سے وہ ان کے نظریے کے مطابق ایک مکمل عدد تھا اور اس میں حساب وکتاب کی سہولتوں کے علاوہ طلسمی تاثیر بھی تھی۔ حساب وکتاب میں بابلیوں نے چھے کو جو اہمیت دی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کسی دائرے کو اس کے نصف قطر اسے چھے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا تھا اور اسی بنیاد پر انھوں نے پورے دائرے میں ۳۶۰ درجے کے زاویوں کو متعین کیا تھا اور کسی بھی اکائی کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ زاویوں کا اس طرح شمار اور ایک گھنٹے کو ساٹھ منٹوں میں اور ہر منٹ کو ساٹھ سکنڈوں میں اور ایسا ہی نقشوں کے زاویوں میں تقسیم کا طریقہ آج بھی رائج ہے۔ چنانچہ بابلیوں نے چھے دن کام کرنے کی روایت قائم کی اور اس کے بعد ایک دن عبادت اور آرام کے لیے رکھا گیا۔ اس طرح سات دن کے ایک ہفتے کو قبولیت حاصل ہوئی۔ پھر بابلیوں نے اجرام فلکی کے مطالعے میں خاص دلچسپی دکھائی اور انھوں نے سورج، چاند، عطارد، مریخ، زہرہ، مشتری، اور زحل سات ستاروں کی علم نجوم میں اہمیت پر زور دیا اور ہفتے کے دنوں کو ان سے منسوب کیا۔ مصریوں نے بھی اسی عقیدے کو اپنے علم ہیئت کی بنیاد بنایا۔ مصریوں سے یونانیوں اور رومیوں نے اس روایت کو اختیار کیا۔

سات دن کے ایک ہفتے کی دوسری بنیاد یہودیوں کی کتابیں تھیں جن میں یہ بتایا گیا کہ خدا نے پوری کائنات کی تخلیق چھ دن میں کی اور ساتویں دن اس نے آرام کیا۔ اس ساتویں دن جسے یوم السبت کہا گیا سارے کام کی ممانعت کی گئی۔ اسلام میں بھی چھ دن کی تخلیق کو مانا گیا لیکن ساتواں دن (یعنی جمعہ) بڑے اجتماعات میں شامل ہو کر عبادت کرنے کا تو ہے لیکن خود کو کاروبار زندگی سے منقطع کر لینے اور لہو ولعب میں ضائع کرنے کا نہیں۔ اس طرح سات دن کا ہفتہ ماننے کی ایک مذہبی بنیاد بھی فراہم ہوئی لیکن ''نئی دنیا'' کی ''انکا'' تہذیب پرانی دنیا کی روایت سے غیر متاثر رہی اور وہاں سات دن کے ہفتے کا رواج نہیں تھا۔

ان دو بنیادوں کا اثر ہفتے کے دنوں کے ناموں پر دکھائی دیتا ہے۔ کئی زبانوں میں ہفتے کے عام دنوں کے نام شمار کے اعتبار سے عددوں پر ہیں۔ عربی میں اتوار کو پہلا دن (یوم احد) کہتے ہوئے سلسلہ جمعرات کو پانچواں دن (یوم الخمیس) کہنے تک پہنچتا ہے۔ بھاشا انڈونیشیا میں بھی ان دنوں کے یہی عربی نام ملتے ہیں۔ فارسی میں سنیچر کو شنبہ کہا جاتا ہے ' اتوار کو یکشنبہ اور اسی قیاس پر دوسرے نام رکھتے ہوئے جمعرات کے لیے پنجشنبہ تک پہنچتے ہیں فارس میں اسلامی اثر پہنچنے سے قبل جمعے کو شش شنبہ کا نام دیا جاتا تھا۔ ترکی میں بھی بعض دنوں کے نام اسی کے مثل ہیں۔ پرتگالی میں پیر کو دوسرا ہاٹ(Segunda Feira) پھر تیسرا چوتھا وغیرہ کہتے ہوئے جمعے کو چھٹا ہاٹ کہا جاتا ہےFeira کا مطلب کاروبار کا دن یا ہاٹ کا دن ہوتا ہے۔ یونانی میں بھی پیر کو دوسرا دن کہتے ہوئے جمعرات کو پانچ تک گنتی پہنچتی ہے۔ چینی میں پیر کو پہلا نمبر دیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ سنیچر کو چھٹے نمبر تک چلتا ہے۔ دنوں کو نام دینے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انھیں اجرام فلکی کے نام دیئے جائیں۔ ان میں اکثر سنیچر کو زحل ' اتوار کو سورج اور پیر کو چاند سے منسوب کرنے کا رواج ہے۔ باقی دنوں کے نام یا تو دوسرے سیاروں کے نام پر رکھے جاتے ہیں یا پھر کچھ دیوی دیوتاؤں وغیرہ کے نام پر۔

سنیچر کو مسلم کیلنڈر میں ہفتے کا پہلا دن مانا جاتا ہے کیونکہ جمعے کو ہفتے کا سب سے متبرک دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے اور اسلامی حکومت والے اکثر علاقوں میں جمعہ کے روز ہفتہ وار چھٹی رہتی ہے۔ اردو نام سنیچر زحل ستارے سے اس دن کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ سنسکرت میں زحل کو شنی کہتے ہیں۔ سنیچر کا لفظ سنسکرت کا لفظ شنیش چر کی بدلی

ہوئی شکل ہے۔ ''شنش'' کا مفہوم آہستگی کے ساتھ اور چر کا چلنے والا ہوتا ہے' کیونکہ یہ مانا جاتا ہے کہ زحل ستارہ بہت آہستہ چلتا ہے اس لیے زحل کا نام ہی شنش چر یا سنیچر ہو گیا۔ ہندی میں اس دن کو زحل سے منسوب کرتے ہوئے شنیوار کہا جاتا ہے۔

انگریزی میں زحل کے لیے ''سے ٹرن'' کا لفظ آتا ہے اور اسی مناسبت سے سنیچر کو سے ٹرڈے کہتے ہیں۔ لاطینی زبان میں بھی یہ دن سے ٹرن سے منسوب ہے۔

فارسی میں سنیچر کو شنبہ کہا جاتا ہے۔ فرہنگ آنند راج کے مطابق لفظ شنبہ پہلے شنبد تھا اور اس کے معنی گنبد کے تھے۔ کہا جاتا ہے روایتی ایرانی بادشاہ بہرام گور نے سات مقاموں پر سات گنبد بنار کھے تھے اور ہر گنبد کسی ستارے سے منسوب تھا۔ ہر روز بادشاہ' اس ستارے سے منسوب مخصوص پوشاک پہن کر اپنا دن اس دن سے تعلق رکھنے والے گنبد میں بسر کرتا تھا۔ اسی بنا پر ہر دن کو شنبد کہا جاتا تھا جو بعد میں شنبہ ہو گیا شنبہ کو سنیچر کے لیے مخصوص کیا گیا اور آگے دنوں کو یکشنبہ (اتوار)۔ دوشنبہ (پیر)' سہ شنبہ (منگل)' چہار شنبہ (بدھ) اور پنجشنبہ (جمعرات) کر دیا گیا۔

عربی میں سنیچر کو یوم السبت کہتے ہیں جو کہ عبرانی ''شبات'' کی شکل ہے۔ یہ عبرانی لفظ شابت سے مشتق ہے جس کے معنی آرام ہوتے ہیں۔ اس وقت دنیا کی کئی زبانوں میں سنیچر کے لیے ''سبت'' سے مماثلت رکھنے والے نام رائج ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد نامۂ عتیق (Old Testament) کی کتاب خروج (Exodus) کے بیسویں باب میں جن دس احکامات الٰہی (Ten Commandments) کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے چوتھا حکم چھے دن کام کرنے کے بعد ساتویں دن کو خدا کے دن کی حیثیت سے متبرک سمجھنے سے متعلق ہے۔ اطالوی' اسپینی' یونانی' روسی' پولش' چیک' سربوکروٹ' فرانسیسی' جرمن' بھاشا انڈونیشا میں سنیچر کے لیے ''سبت'' پر مبنی ہی نام اپنائے گئے۔ سویڈن' ناروے اور ڈنمارک میں اس دن کو لارڈ کے دن کی حیثیت سے پہچانا گیا۔ مسیحیوں نے اتوار کو ہفتے کے مقدس ترین دن کی حیثیت دی اور سنیچر کے ساتھ ''یوم السبت'' کا تقدس بھی برقرار رکھنا چاہا۔ اس بنا پر سنیچر اور اتوار کو کام سے دور رہ کر اختتام ہفتہ (Week End) منانے کا رواج ہوا۔

اتوار شروع میں آدتیہ وار تھا۔ سنسکرت میں آدتیہ سورج کے ناموں میں سے

ایک نام تھا اور اتوار سورج کا دن مانا جاتا تھا۔ آدتی کے لفظی معنی مطلق اور لا محدود کے ہوتے ہیں۔ میکس میلر نے آدتی کے معنی وہ نظر آنے والی لا محدود دنیا بتائے ہیں جو ہماری دنیا سے 'بادلوں سے آسمان سے پرے ہے۔ روایت کے اعتبار سے آدتی دیوتاؤں کی ماں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آدتی کے آٹھ بیٹے تھے لیکن جب وہ دیوتاؤں کے پاس گئی سات بیٹوں کو تو لے گئی مگر آٹھویں بیٹے مارتنڈ یعنی سورج کو چھوڑ گئی۔ جسے آدتی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے آدتیہ کا نام دیا گیا۔ سورج کو سنسکرت میں روی بھی کہا جاتا ہے اور اسی نسبت سے ہندی میں اتوار کو روی وار کہا جاتا ہے۔

اتوار کی یہی سورج سے نسبت انگریزی میں سنڈے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جرمن اور ڈچ کے علاوہ سویڈن ناروے اور فن لینڈ کی زبانوں میں بھی سورج سے اس تعلق کا اتوار کے نام سے اظہار کیا گیا ہے۔

مسیحی شروع سے اتوار کو مقدس دن کی حیثیت سے نہیں مناتے تھے۔ بعد میں اس عقیدے کے تحت کے حضرت عیسی علیہ السلام کو جمعہ کے دن صلیب پر چڑھانے کے بعد اتوار کے دن آسمان پر اٹھالیا گیا۔ اتوار کو خاص مذہبی اہمیت دی۔ روسی میں تو اسی بنا پر اتوار کے لیے استعمال ہوتے والے لفظ کا تعلق ہی دوبارہ اٹھنے اور پھر سے زندہ ہونے سے ہے۔ یہ بات ۳۲۱ء کی ہے جب شہنشاہ قسطنطین نے اتوار کو عام چھٹی کا دن مقرر کرتے ہوئے اسے عبادت کے لیے وقف کیا اور اس دن دوسرے کام کاج کی ممانعت کی۔ بعض ملکوں میں اتوار کو "لارڈ کے دن" کا نام دیا اور فرانسیسی 'اسپینی' اطالوی اور پرتگالی میں اتوار کے لیے ایسے ہی الفاظ شامل ہیں۔

اتوار کے بعد آنے والے دن کے لیے ہندستان کے مسلم سماج میں پیر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ "پیر" فارسی میں بوڑھے یا بزرگ، ولی اللہ 'روحانی پیشوا' یا درویش کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی اس لفظ کے ساتھ تقدس اور احترام کا تاثر وابستہ رہتا ہے۔ اس دن کو بھی بزرگ دن مانا گیا ہے کیونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں اس کی ایک خاص اہمیت رہی۔ عام روایت کے مطابق آپ کی ولادت اور وفات دونوں پیر کے دن ہی ہوئی تھیں۔

ہندی اور اس کے علاوہ ہندستان کی کئی دوسری زبانوں میں اس دن کو سوموار یا

صرف سوم کہتے ہیں۔ سوم چاند کو کہتے ہیں۔ اس دن کو مصریوں نے چاند سے وابستہ کیا ہے اور پھر لاطینی زبان کے ذریعے یہ یوروپ کی زیادہ تر زبانوں میں پہنچا۔ بعض زبانوں میں ''مون'' (Moon) سے ملتے جلتے مادّے سے یہ نام بنا جیسے انگریزی کا ''منڈے'' جرمن، ڈچ اور فن لینڈ سویڈن اور ڈنمارک کی زبانوں میں ایسے الفاظ میں بعض زبانوں میں چاند کے لاطینی لفظ ''لونا'' سے مشتق الفاظ بنائے گئے جیسے فرانسیسی، اسپینی اور اٹلی، اور رومانیہ کی زبانوں میں۔ روسی زبان میں جو نام اپنایا گیا اس کا مفہوم ''ہفتے'' کے بعد ہے کیونکہ اتوار کو ہفتہ ختم ہو جانے کے بعد کا یہ دن ہے۔ پیر کے لیے اسی سے ملتے جلتے الفاظ چیک، سربو کروٹ کے ساتھ ساتھ پولینڈ کی زبان میں ملتے ہیں۔ (اردو میں اسی قسم کا لفظ ''ہفتہ'' سنیچر کے لیے مستعمل ہے کیونکہ یہاں سات دن کا ہفتہ جمعے کے دن ختم ہو جاتا ہے۔)

منگل مریخ سے منسوب ہے۔ اس لیے اسے ہندی میں منگل وار کہا جاتا ہے۔ رومن دیومالا میں لڑائی کے دیوتا کا نام مارٹس ہے۔ رومن لوگ منگل کے دن کو اس سے منسوب کرتے تھے۔ اسپین، فرانس، اٹلی اور رومانیہ میں اسی مارٹس کے تعلق سے اس دن کے نام ہیں۔ جرمنی اور شمالی یوروپ میں ناروے کی دیومالا کا اثر رہا ہے۔ اس دیومالا میں سب سے بڑا دیوتا اوڈن (Odin) تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی فرگ (Frigg) اور دو بیٹوں ٹر (Tyr) اور تھور (Thor) کے نام اس وجہ سے ذہن میں رکھنا ضروری ہیں کہ انگریزی زبان میں ہفتے کے چار دن کے نام ان دیوی دیوتاؤں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ منگل کو انگریزی میں ٹیوزڈے یعنی ٹیو (Tiu) کا دن کہتے ہیں۔ ٹیو جسے ٹر (Tyr) بھی کہا جاتا ہے اوڈن کا بیٹا اور تھور کا چھوٹا بھائی تھا۔ یہ بہت بہادر تھا اور ناروے کی دیومالا میں اسے جنگ کے دیوتا کی جگہ حاصل تھی۔ یعنی وہ رومن دیومالا کے مارٹس یا مارس کا قائم مقام تھا اور اسی وجہ انگریزی کے ساتھ ساتھ سویڈن ڈنمارک اور ناروے کی زبانوں میں منگل کے لیے ٹر (Tyr) سے نسبت رکھنے والے نام شامل ہیں۔

بُدھ۔ عطارد نامی سیارے سے نسبت رکھتا ہے اور ہندی میں اس دن کو بدھ وار کہا جاتا ہے۔ ہندستانی روایت کے مطابق بدھ کی ماں تارا تھی جو برہسپتی کی بیوی تھی۔ سوم یعنی چاند تارا کو اڑا کر لے گیا جس کی وجہ سے دیوتاؤں کی دنیا میں زبردست لڑائی چھڑ گئی۔ بالآخر برہما نے بیچ بچاؤ کر کے تارا کو برہسپتی کے پاس واپس کرا دیا۔ بعد میں تارا نے بدھ کو

جنم دیا۔ بدھ اتنا خوبصورت تھا کہ برہسپتی اور سوم دونوں اس کے باپ ہونے کا دعوا کرنے لگے۔ تارا خاموش رہی لیکن جب بدھ نے اپنی ماں کو شراپ دینے کی دھمکی دی اور برہما نے بھی حکم دیا تو تارا نے یہ بتایا کہ بدھ سوم کا بیٹا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں جس میں چاند اور مشتری دونوں کے نام پر دن موجود ہیں عطارد کا دن رکھا جانا ضروری تھا۔ رومن لوگوں نے بھی اس دن کو عطارد یا مرکری (Mercury) کے ساتھ جوڑا اور فرانسیسی 'اسپینی' اطالوی میں بدھ وار کے لیے مرکری کے تعلق سے ہی نام بنائے گئے۔

ناروے کی دیومالا کا سب سے بڑا دیوتا اورڈن یا ووڈن (Woden) تھا جس نے Chaos یعنی عدم نظام کو قتل کیا اور اس کے جسم سے زمین 'اس کے گوشت سے میدان' اس کی ہڈیوں سے پہاڑ' اس کے خون سے سمندر اور اس کے کھوپڑی سے خلا پیدا کی۔ جرمن قبائل اس میں عطارد کے صفات بھی دیکھتے تھے چنانچہ سویڈن ناروے 'ڈنمارک اور ہالینڈ کی زبانوں میں بدھ کے دن کے نام میں اوڈن یا ووڈن کے نام کو شامل کیا گیا۔ انگریزی نام وڈنس ڈے بھی ووڈن سے تعلق رکھتا ہے۔

بدھ ہفتے کے بیچوں بیچ کا دن مانا جاتا ہے' اسی لیے جرمن' روسی' چیک' سربوکروٹ اور پولینڈ اور ہنگری کی زبانوں میں بدھ کو درمیان ہفتہ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ عربی اور بھاشا انڈونیشیا میں بدھ کو یوم الاربعاء کہتے ہیں۔ یونانی میں بھی اس کو چوتھا دن کہا جاتا ہے جس طرح فارسی اور ترکی میں اسے چہار شنبہ کہتے ہیں۔

جمعرات اکیلا نام ہے جس میں رات کی نسبت رکھی گئی ہے۔ دوسری زبانوں میں رات کے تعلق سے دن کا کوئی نام نہیں رکھا گیا۔ دراصل یہ جمعے کی تیاری کا دن ہے۔ جمعرات کے دن اور نماز جمعہ کے درمیان صرف ایک رات کی دوری ہوتی ہے۔ یونانی میں اسی طرح جمعے کو تیاری کے دن کا نام دیا جاتا ہے وہاں وہ یوم السبت کی تیاری کا دن ہے۔

ہندی میں جمعرات کو برہسپتی وار کہا جاتا ہے برہسپتی یا مشتری سب سے بڑا سیارہ ہے اس لیے اس کی جسامت کی وجہ سے اسے گرو بھی کہتے ہیں اور اسی نسبت سے جمعرات کو ہندی میں کبھی گروو ار کا نام دیا جاتا ہے۔ لاطینی میں بھی جمعرات کو مشتری یعنی جیو پیٹر یا جوو (Jove) سے موسوم کیا جاتا ہے اور فرانسیسی 'اطالوی اور رومانیہ کی زبانوں میں Jove کے تعلق سے ہی جمعرات کے نام بنائے گئے ہیں۔ جرمن قبیلے جن ممالک میں پھیلے

تھے وہاں ناروے کی دیومالا میں شامل آسمان کے دیوتا کو عزت بخشنے کے لیے اس دن کے نام کو چنا تھا۔ تھور Thor سب سے بڑے دیوتا اوڈن کا بڑا بیٹا تھا اور ناروے کی دیومالا میں جیوپیڑ کا ہم پلہ تھا۔ چنانچہ انگریزی میں اس کے نام پر تھرسڈے جمعرات کے لیے وضع کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سویڈن ناروے، ڈنمارک، فن لینڈ کی زبانوں میں تھور کے نام پر مبنی جمعرات کے نام بنائے گئے۔ تھور کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ آسمان میں گرج کا بھی دیوتا تھا۔ اسی لیے جرمن اور ڈچ زبانوں میں جمعرات کو گرج کا دن کہا گیا۔

فارسی میں اسے پنجشنبہ، عربی میں یوم الخمیس (پانچواں دن) کہا گیا۔ عربی نام کی بنیاد پر بھاشا انڈونیشیا اور سواحیلی میں بھی اسے پانچواں دن کہہ کر پکارا گیا۔ پرتگالی میں اسے پانچواں ہاٹ کا نام دیا گیا۔ لیکن روسی اور اسی کی بنیاد پر پولینڈ اور ہنگری زبانوں اور چیک اور سربوکروٹ میں جمعرات کو چوتھا دن کہا گیا۔

جمعہ مسلمانوں کے لیے ہفتے کا سب سے متبرک دن ہے۔ اس دن مسلمان روز کی نمازوں کے مقابلے میں زیادہ بڑی جماعت میں اکٹھا ہو کر دوپہر کے وقت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس وقت نہا دھو کر، صاف ستھرے کپڑے زیب تن کرنے کا حکم ہے اسی مناسبت سے آرائش کا بھی رواج ہوا تو اس دن کو "یوم الزینہ" یعنی زینت کا دن بھی کہا جانے لگا۔ "الزینہ" نے فارسی میں "آدینہ" کی شکل اختیار کی اور "آدینہ" کا لفظ اشارۃً جمعے کے لیے آنے لگا۔

ہندی میں جمعہ کو شکروار کہتے ہیں۔ شکر سے ستارہ زہرہ مراد ہے۔ سنسکرت میں شکر کے معنی چمک دار، اور تابناک سفید ہوتے ہیں۔ کیونکہ زہرہ آسمان میں سب سے چمک دار دکھائی دیتا ہے اس لیے اس کو یہ نام دیا گیا۔ رومن لوگوں نے بھی جمعہ کو زہرہ یعنی وینس کا دن مانا اور فرانسیسی، اسپینی اور اطالوی اور رومانیہ کی زبان میں اسے وینس کے تعلق سے ہی پہچانا گیا۔

انگریزی میں جمعے کو فرائڈے کا نام دیا گیا۔ یہ نام ناروے کی دیومالا میں سب سے بڑی دیوی (اور اوڈن کی بیوی) فرگ (Frigg) سے نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ فرگ ناروے کی دیومالا میں زہرہ کی ہم پلہ تھی اور اسے شادی بیاہ کی دیوی مانا جاتا تھا۔ جرمن اور ڈچ، اور سویڈن ناروے اور ڈنمارک کی زبانوں میں بھی جمعہ کے لیے فرگ کی نسبت کو

بر قرار رکھا گیا۔

ہفتے کے بعد زیادہ بڑی اکائی مہینے کی ہے جس کے لیے فارسی میں ماہ' ہندی میں ماس اور انگریزی میں منتھ کے الفاظ مستعمل ہیں۔ ان الفاظ میں یہ بات مشترک ہے کہ ان سب کا تعلق چاند سے ہے۔ چاند کا کسی خاص شکل میں ایک مخصوص وقفے کے ساتھ ظاہر ہونا ایک عام مشاہدہ تھا۔ چنانچہ شروع میں وقت کے شمار کے لیے مہینے کا تصور تقریباً ہر جگہ چاند پر مبنی تھا۔ یہ ضرور ہے کہ مہینہ کس دن سے شروع ہو اس کے بارے میں الگ الگ چلن تھے۔ کہیں پوری اندھیری رات یعنی اماوسیہ سے' کہیں اماوسیہ کے بعد دوبارہ دکھائی دینے والے چاند سے اور کہیں پورے چاند کی رات یعنی پونم کو مد نظر رکھتے ہوئے نئے مہینے کے آغاز کو طے کیا گیا۔ بعد میں تاریخوں کو موسموں سے مربوط رکھنے کے لیے شمسی سال وضع کیا گیا۔ لیکن قمری مہینے کی روایت کو بر قرار رکھتے ہوئے مہینے میں اوسطاً تیس دن کی گنجایش رکھی گئی۔

اس وقت ہندستان میں دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح مہینوں کے ایسے نام اختیار کیے گئے ہیں جو رومن بنیادوں پر ہیں۔ ان ناموں میں سے چھ تو دیوی دیوتاؤں' رواجوں اور تہواروں پر ہیں۔ دو تاریخی شخصیتوں پر اور چار ایسے عددوں پر جن کی ترتیب کے اعتبار سے اب معنویت بر قرار نہیں رہی ہے۔

جنوری کا نام ایک رومن دیوتا "جےنس" کے نام پر ہے جسے قدیم رومن لوگ دروازوں اور گذرگاہوں کے محافظ کی حیثیت سے مانتے تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق اس کے دو چہرے ہوتے تھے ایک سامنے اور دوسرا پیچھے کی طرف یعنی عمارت کے اندر اور باہر دونوں طرف اس کی نظر ہوتی تھی۔ جنوری اب سال کا پہلا مہینہ ہے اور اس کی وجہ سے "جےنس" کے دوہرے چہرے کی معنویت بڑھ گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک چہرے سے پچھلے سال کو اور دوسرے سے اگلے سال کو دیکھ رہا ہے لیکن جنوری ہمیشہ سے سال کا پہلا مہینہ نہیں تھا۔ قدیم رومن لوگوں نے ابتداءً زراعتی کاموں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک حساب کتاب تیار کیا تھا جو موجودہ ۲۱ مارچ کے قریب سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں دس مہینے ہوتے تھے۔ شروع کے چار مہینے ۳۱' ۳۱ دن اور باقی تیس ۳۰ دن کے۔ اس طرح ۳۰۴ دن کا حساب رکھا جاتا تھا۔ سردی کے موسم میں جب زمین برف سے ڈھک جاتی

تھی تو سارا زرعی کاروبار بھی معطل ہو جاتا تھا اور ان دنوں کا کوئی حساب بھی نہیں رکھا جاتا تھا لیکن بعد میں اس باقی وقت کو دو مہینوں کی شکل میں دکھایا جانے لگا اور انھیں جنوری اور فروری کا نام دیا گیا لیکن اُن کے حساب میں دو فالتو مہینے تھے کیونکہ دسمبر کے ساتھ سال کا اختتام ہو جاتا تھا۔ جنوری اس طرح سال ختم ہونے پر آتا تھا اور اس کی حیثیت پھاٹک کے باہر کھڑے چوکیدار جیسی تھی۔ رومن کیلنڈر کی اس گڑبڑ کو جولیس سیزر نے سدھارا اور اس نے مصریوں کے شمسی کیلنڈر کو اپنا کر ۳۶۵ دن کا سال رائج کیا۔ اور مہینوں کے حساب و کتاب کو منظم کیا لیکن پہلی جنوری کو نئے سال کے پہلے دن کی حیثیت سے دھوم دھام کے ساتھ منانے کی روایت اس وقت شروع ہوئی جب رومن حکومت پوری طرح مسیحی حکومت کے تحت آگئی اور پہلی جنوری کی تقریبات 'کرسمس کی ہفتہ بھر کی تقریبات کے ساتھ منسلک ہو گئیں۔

فروری انگریزی نام فیب رواری کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ نام بعض ایسی رسومات سے جڑا ہوا ہے جنھیں فیب "روارا" کہا جاتا تھا۔ فیب روارا کے لفظی معنی کسی آلودگی یا نجاست سے پاک کرنے کے ہیں۔ رومن لوگ ۱۵ر فروری کو افزائش نسل اور توسیع خاندان کا تہوار منایا کرتے تھے۔ شہر روم کے دو روایتی بانیوں 'رومولس اور ریمس کو ایک مادہ بھیڑیا نے اپنا دودھ پلا کر پالا تھا۔ اس جانور نے ان دونوں بچوں کو جس غار میں رکھا تھا جس کے باہر ۱۵ر فروری کو بکروں کے ساتھ ایک کتے کی بھی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ اس بھینٹ سے نکلنے والے خون کو دو نوجوانوں کے جسم پر مل دیا جاتا تھا اور ان کے ہاتھ میں بھینٹ کیے گئے بکروں کی کھال کے لمبے تسمے دے کر انھیں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ نوجوان پوری بستی کا چکر لگاتے اور جو بانجھ عورت سامنے آتی اس کی ان تسموں سے پٹائی کرتے۔ مانا جاتا تھا کہ اس طرح اس کے بانجھ پن کی نحوست دور ہو جاتی تھی۔ خیال تھا کہ تسموں میں یہ طاقت جونو نام کی سب سے بڑی دیوی کی برکت سے آتی تھی چنانچہ جونو کو جن ناموں سے پکارا جاتا تھا ان میں سے ایک فیب روارِیا بھی تھا۔ اس لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فروری کا نام جونو کے نام پر ہے۔

مارچ کا نام رومن لوگوں نے اپنے لڑائی کے "دیوتا" مارس کے نام پر رکھا تھا۔ مارچ میں سردی کے خاتمے کے بعد زمین پر پڑی ہوئی برف پگھلنے لگتی اور آمد و رفت میں

آسانی بڑھ جاتی۔ آپس میں لڑنے والے قبیلے بھی دشمنوں پر حملے کے لیے نکل پڑتے اور جنگ کے دیوتا سے اپنی کامیابی کے خواہاں ہوتے۔ اسی مناسبت سے اس مہینے کو جنگ کے دیوتا مارس کے نام سے پکارا جاتا۔

لیکن مارچ کی اہمیت خاص طور پر موسم میں آنے والی اس تبدیلی کی وجہ سے تھی جو ۲۱ر مارچ کے بعد رونما ہوتی ہے۔ ۲۱ر مارچ کو سورج شمالی نصف کرّے کی جانب لوٹنا شروع کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس خطۂ ارض میں گرمی بڑھنے کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور موسم بہار کا آغاز ہوتا ہے' اسی لیے الگ الگ ملکوں میں فصلی سال کی ابتداء ۲۱ر مارچ سے مانی جاتی ہے۔ ہندستان کے فصلی اور شک وسنوں کا پہلا دن اسی تاریخ کو ہوتا ہے اور پارسی اسی دن نوروز مناتے ہیں۔ رومن سال بھی ۲۵ر مارچ سے شروع ہوتا تھا۔

اپریل کا لفظ کہاں سے نکلا' اس بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپریل جس لفظ سے نکلا ہے وہ یونان کی محبت کی دیوی ایفروڈائٹی کے نام کا مخفف ہے۔ ایفروڈائٹی کو رومن وینس کا نام دیتے ہیں اور کیونکہ اپریل میں بہار اپنے عروج پر ہوتی ہے اس لیے اس کے ساتھ موج مستی کی ایک خاص فضا بن جاتی ہے جو ایفروڈائٹی یا وینس سے، وابستہ تصورات کے عین مطابق ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اپریل ایک ایسے لاطینی لفظ سے نکلا ہے جس کا مطلب کھلنا ہوتا ہے۔ اسے پھولوں کا کھلنا بھی مراد لے سکتے ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں سبزہ اور پھول پھر سے نظر آنے لگتے ہیں اس لیے اپریل کا نام ماحول سے موزونیت رکھتا ہے۔

موسم بہار کی ابتداء کو منانے کے لیے کئی سماجوں میں الگ الگ قسم کے رسم ورواج جاری تھے جن سے اس موسم کی خوشی اور انبساط کو ظاہر کیا جاتا تھا۔ ان میں ناچ گانے اور ہنسی مذاق کے پروگرام بھی شامل ہوتے۔ اسی قسم کا ایک تہوار ہولی ہے جس میں ناچ گانے' رنگ اور بھنگ کے علاوہ لوگوں کو بیوقوف بنا کر لطف لینا بھی شامل ہوتا ہے۔

مغربی تہذیب کی تقلید میں ہندستان میں بھی اپریل فول منانے کا رواج ہوا۔ اس سلسلے میں کئی روایات ہیں۔ رومن لوگ سال نو کی تقریبات جو ۲۵ر مارچ کو شروع ہوتی تھیں ایک ہفتے تک مناتے تھے اور پہلی اپریل کو ان کا خاتمہ ہوتا تھا۔ آخری دن لوگ دوسروں کے ساتھ عملی مذاق کر کے انھیں بیوقوف بنا کر لطف لیا کرتے۔ کسی کو بے

مطلب کے کام میں لگا دینے کے لیے ایک روایت کا بھی سہارا لیا جاتا۔ اس روایت کا تعلق کھیتی باڑی کی رومن دیوی سیریز سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیریز کی بیٹی پرازرپین آسمانی باغ میں کھیل رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ بہار کے ساتھ ساتھ ہر طرف خوبصورت پھول کھلے ہوئے ہیں۔ پرازرپین نے کچھ پھول توڑ کر اپنے دامن میں بھرے ہی تھے کہ تحت الثریٰ کا دیوتا پلوٹو نمودار ہوا اور پرازرپین کو اٹھا کر چمپت ہو گیا۔ پرازرپین کی ماں نے پرازرپین کی چیخوں کی گونج سنی اور وہ اس گونج کے پیچھے دوڑ پڑی۔ لیکن محض گونج کی وجہ سے کسی کو پکڑ پانا ایک احمقانہ فعل تھا اور تب سے یہ طریقہ ہو گیا کہ کسی بات کو سن کر آسانی سے یقین کرنے والے لوگوں کو کسی بھی احمقانہ کام کے لیے دوڑا کر لطف لیا جاتا ہے۔ اپریل فول منانے کا موجودہ انداز غالباً ۱۵۶۲ء میں اس وقت شروع ہوا جب انگلستان میں پرانے جولین کیلنڈر کی جگہ موجودہ گری گورین کیلنڈر اختیار کیا گیا اور نئے سال کی تقریبات جو پہلے ۲۵ ر مارچ سے منائی جاتی تھیں وہ پہلی جنوری کو منائی جانے لگیں لیکن کیونکہ پہلی جنوری کی تقریبات کرسمس کی تقریبات کا حصہ تھیں اس لیے ان کی سنجیدگی کو مد نظر رکھتے ہوئے ان میں عملی مذاق اور چھیڑ خانی کو شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا اور اس قسم کے غیر سنجیدہ پروگرام پہلے کی طرح پہلی اپریل کو ہی جاری رہے۔

مئی کا نام رومن دیوی "مایا" کے نام پر ہے جو کہ نشوونما اور فراوانی کی دیوی مانی جاتی تھی اور اس کے نام پر بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ یہ مہینہ یوروپ میں موسم بہار کے بھرپور شباب کا ہوتا ہے اور پرانے زمانے میں پہلی مئی بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ لوگ رات کو جنگل میں منگل مناتے۔ چیختے چلاتے، شور مچاتے ہوئے سڑکوں پر اور کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے دوڑتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس سے خبیث روحیں بھاگ جائیں گی۔ کھلے میدان میں ایک لکڑی کھمبا لگایا جاتا تھا جس کو پھولوں اور جھنڈیوں سے سجایا جاتا اور لوگ اس کے ارد گرد ناچتے اور گاتے تھے۔ کسی لڑکی کو مئی کی ملکہ کی شکل میں چنا جاتا اور اس کی پھولوں کا تاج پہنا کر آؤ بھگت کی جاتی۔

آج کل پہلی مئی کو محنت کشوں کے دن کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ ۱۸۸۳ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک مل مالک رابرٹ اوون (Robert Owen) نے جو مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کے حق میں تھا پہلی مئی کو محنت کشوں کا جشن منانے کا فیصلہ کیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کنیڈا کی ٹریڈ یونیوں نے فیکٹری میں کام کے وقت کو آٹھ گھنٹے تک محدود کرنے کے لیے پہلی مئی کو ہڑتال ۱۸۸۹ء میں پیرس میں بین اقوامی سوشلسٹ کانگریس نے پہلی مئی کو یوم احتجاج کی شکل میں منانے کا فیصلہ کیا تاکہ حکومتوں کو کام کرنے کے وقت کو آٹھ گھنٹے کی حد میں رکھنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ اب یوم محنت بیشتر صنعتی ملکوں میں منایا جاتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینڈا میں اسے ستمبر میں مناتے ہیں۔

جون کے نام کی اصل کے بارے میں کئی نظریات ہیں۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے یہ سب سے بڑی رومن دیوی اور جیوپیٹر کی بیوی "جونو" کے نام پر ہے جو کہ عورتوں اور شادی بیاہ کی دیوی مانی جاتی ہے۔ اسی رعایت سے جون میں ہونے والی شادیاں اچھی سمجھی جاتی تھیں اور جون کو بیاہ کے مہینے کی شکل میں دیکھا جاتا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ کیونکہ مئی کو بزرگوں سے منسوب کیا جاتا تھا، جون کو جونیروں اور خوردوں سے منسلک کیا گیا۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ جون کی اصل ایک ایسا لاطینی لفظ ہے جس کا مطلب خاندان ہوتا ہے اور جون کا مہینہ شادی کا مہینہ ہونے کی وجہ سے خاندان کا بھی مہینہ ہے۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ یہ جونیس نام کے روم کے ایک خاندان سے متعلق ہے۔ اسی خاندان کے لوگوں نے جن میں بروٹس شامل تھا، جولیس سیزر کو قتل کیا تھا۔

اگر جون جولیس سیزر کے قاتلوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے تو جولائی کا مہینہ خود جولیس سیزر ہے۔ اور اس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے کیونکہ ۴۴ قبل مسیح میں جب جولیس سیزر کو قتل کر دیا گیا تو اس کے دوست اور اس کے طاقتور جنرل مارک اینٹنی نے رومن سینٹ میں یہ تجویز رکھی کے اس مہینے کا نام جولیس سیزر کے نام پر جولیس رکھا جائے، کیونکہ اس مہینے کی بارہ تاریخ کو جولیس سیزر پیدا ہوا تھا۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی اور اس مہینے کو جسے پانچواں کہا جاتا تھا (کیونکہ مارچ سے شروع ہونے والے سال میں یہ پانچواں مہینہ تھا) جولیس کا نام دیا گیا جو انگریزی میں بدل کر جولائی ہو گیا۔ جولیس سیزر کو رومن کیلنڈر میں جگہ پانے کا اس وجہ سے بھی حق تھا کہ اس نے اس کیلنڈر کی گڑبڑ کو دور کرتے ہوئے مصری کیلنڈر کے نمونے پر اصلاحات کی تھیں اور رومن کیلنڈر کو سوا ۳۶۵ دن کا بنایا۔ سال میں عام طور پر ایک مہینہ ۳۰ دن کا اور ایک مہینہ ۳۱ دن کا مقرر کیا گیا۔ بعد میں

یہ کیلنڈر جولیس سیزر کی اہم ترمیمات کی بنا پر جولین کیلنڈر کہلایا جس کا نفاذ ۴۶ قبل مسیح میں ہوا۔ یہ کیلنڈر یوروپ میں ۱۵۸۲ء تک، انگلینڈ میں ۱۷۵۲ء تک اور روس میں ۱۹۱۸ء تک جاری رہا۔

اس طرح پانچواں مہینہ تو جولیس سیزر کے حصے میں چلا گیا اب اس مہینے کی باری تھی جو لاطینی میں چھٹا کہلاتا تھا۔ اس پر آگسٹس سیزر نے قبضہ کیا جو پہلا رومن شہنشاہ تھا۔ وہ جولیس سیزر کا بھتیجا تھا اور طاقت اور شہرت میں خود کو کسی طرح جولیس سیزر سے پیچھے نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایک مہینے کا نام پہلے ہی جولیس سیزر کے نام پر رکھا جا چکا تھا اس لیے اس نے کسی دوسرے مہینے کو اس نام سے موسوم کرنا چاہا۔ اس کی پیدائش تو ستمبر میں ہوئی تھی مگر وہ اس سے پہلے والے مہینے کو اپنے لیے مبارک سمجھتا تھا کیونکہ اس مہینے میں اُسے شہنشاہیت ملی تھی۔ اسی مہینے میں اس نے مصر کو شکست دی تھی اور خانہ جنگی کو کچلا تھا۔ چنانچہ اس نے جولائی کے بعد والے مہینے کا ہی اپنے نام پر آگسٹس کہا جانا پسند کیا جو کہ مختصر ہو کر آگسٹ ہو گیا۔ اب ایک مسئلہ اور پیدا ہوا۔ جولیس سیزر نے اپنے کیلنڈر میں یہ نظام رکھا تھا کہ ایک مہینہ ۳۱ دن کا ہو اور ایک مہینہ ۳۰ دن کا ہو۔ اب کیونکہ جولائی ۳۱ دن کا تھا اس لیے اس کے بعد کے مہینے میں ۳۰ دن تھے۔ لیکن آگسٹس خود کو کسی لحاظ سے بھی جولیس سیزر سے کم نہیں رہنے دینا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنے فرمان کے ذریعہ اگست کے مہینے کو بھی ۳۱ دن کا کر دیا۔ اضافہ کیے ہوئے اس ایک دن کو پورے سال کے حساب میں برابر کرنے کے لیے یہ ضروری ہوا کہ یہ دن کہیں سے کم کیا جائے۔ اس کے لیے طے ہوا کہ سال کے آخری مہینے یعنی فروری میں سے ایک دن گھٹا دیا جائے۔ فروری میں پہلے ہی سے عام حالات میں ۲۹ دن تھے وہ اب ۲۸ رہ گئے۔

آگسٹس کی اس ضد کے بعد مہینوں کے نام بدلنے کا سلسلہ تو بند ہو گیا۔ لیکن باقی چار مہینوں کے نام بچے۔ ان کے نام عددوں پر ساتواں، آٹھواں، نواں، اور دسواں رہے۔ یہ عدد اس ترتیب کو ظاہر کرتے تھے جو مارچ میں شروع ہونے والے سال کے لحاظ سے بنتی تھی۔ اور جو آگسٹس کی ترمیم کے زمانے میں بھی صحیح تھی۔ لیکن جب سال جنوری سے شروع ہونے لگا تو مارچ سے قبل ترتیب میں جنوری اور فروری کے دو مہینے شامل ہو گئے اور اس اعتبار سے اگست آٹھواں مہینہ ہوا اور اس کے بعد آنے والا نواں۔ لیکن اسے ابھی سیپ

ٹیمبر کہتے ہیں جس کے لفظی معنی ساتواں ہوتے ہیں اردو میں سیپ ٹیمبر کا لفظ ستمبر ہو گیا۔
اکتوبر کا مطلب آٹھواں، نومبر کا نواں اور دسمبر کا دسواں ہوتا ہے حالانکہ موجودہ کیلنڈر میں وہ دسویں، گیارھویں، اور بارھویں مہینے ہیں اکتوبر کا نام رومن جنزل جرجے نی کس سیزر نے اپنے نام پر رکھنا چاہا لیکن اس کی نہیں چلی۔ ہاں شہنشاہ ٹٹ ری اس کے نام کو خود رومن لوگوں نے دسمبر کی جگہ دینی چاہی۔ لیکن شہنشاہ نے اس کو قبول نہیں کیا اور مذاق میں سوال کیا کہ اگر گیارہ سیزر ہوئے تو تم لوگ کیا کرو گے۔ اس کے ذہن میں سال کے وہی اصل دس مہینے تھے جو مارچ سے شروع ہو کر دسمبر تک آتے تھے۔

ہجری سال کا پہلا مہینہ محرم ہوتا ہے۔ محرم کے معنی ہیں جس کی حرمت، عزت یا تعظیم کی گئی ہو۔ روایت کے مطابق اس مہینے میں کئی اہم واقعات ظہور میں آئے تھے اور کئی نبیوں کی زندگی میں اس کی اہمیت رہی تھی۔ اس مہینے کی دسویں تاریخ کی جسے عاشورہ کہا جاتا ہے خاص فضیلت ہے۔ عاشورہ کی اصل عشر ہے جس کے معنی دس ہوتے ہیں۔ اسی مہینے میں حضرت حسینؑ اور ان کے اعزاء ورفقاء کو یزید کے لشکر کا سامنا کرنا پڑا اور دس محرم کو آپ کربلا میں شہید ہوئے اس لیے یہ مہینہ شہدائے کربلا کے سوگ کا مہینہ ہے۔
اس مہینے کے ساتھ محرم الحرام کی بھی تخصیص کی جاتی ہے۔ اسلام کے ظہور سے قبل جن تین مہینوں میں عرب قبیلوں کے درمیان لڑائی بند رہتی تھی ان میں سے آخری مہینہ جس میں جنگ وجدال حرام تھا محرم کا تھا۔

دوسرے مہینے کو صفر کہتے ہیں۔ اس نام مختلف معنی بتائے جاتے ہیں۔ بعض لغت نویس اس کا تعلق صفر (یعنی زیرو) سے بتاتے ہیں جس کے اصل معنی خالی کے ہوتے ہیں۔ قدیم عرب قبائل حج کے ایک ماہ قبل لڑائی اور قتل وغارتگری بند کر دیتے تھے۔ لیکن محرم کا مہینہ ختم ہوتے ہی پرانی رنجشوں کا بدلہ چکانے گھر سے نکل جاتے تھے اور گھر خالی ہو جاتے تھے اور خالی گھر والے اس مہینے کو اسی وجہ سے صفر کہنے لگے۔ بعض اوقات اس مہینے کا مرکب نام صفر المظفر لکھا جاتا ہے۔ مظفر کے معنی ہوتے ہیں جسے کامیابی ملی ہو اور اسی کامیابی کی تمنا دل میں لیے ہوئے یہ جنگجو قبائل اپنے گھروں سے نکل پڑتے تھے۔
اسی نام کے سلسلے میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ لفظ صُفر سے نکلا ہے جس کے معنی زرد کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب ان مہینوں کے نام رکھے گئے تھے اس وقت یہ مہینہ غالبا

خزاں کے موسم میں پڑتا تھا جب درختوں کے پتے پیلے پڑنے لگتے تھے اور جھڑنے لگتے تھے۔ کیونکہ صفر کے بعد کے مہینوں میں بھی موسمی خصوصیات کی جانب اشارہ ملتا ہے اس لیے یہ معنی بھی قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں۔

صفر کو بڑا منحوس خیال کیا جاتا تھا کیونکہ اسی کے اول تیرہ روز میں رسول خدا ﷺ سخت بیمار پڑے تھے۔ چنانچہ عورتیں اس مہینے کا نام لینا پسند نہیں کرتی تھیں اور اس کو تیرہ تیزی کہتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ تیرہ تیزی کا یہ نام ملکہ نور جہاں نے ایجاد کیا تھا صفر کے آخری بدھ کو آخری چہار شنبہ کے نام سے بڑے اہتمام سے منایا جاتا تھا کیونکہ اس روز رسول خدا ﷺ نے شدید بیماری کے بعد غسل صحت فرمایا تھا۔

اگلے دو مہینوں کے نام موسم بہار پر رکھے گئے تھے 'ربیع الاول اور ربیع الآخر۔ ربیع کا لفظ عربی میں بہار کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ربیع الاول کی رسول خدا ﷺ کی حیات طیبہ میں خاص اہمیت رہی ہے۔ مانا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت مبارکہ ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ اس تاریخ کو عید میلاد النبی کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔ عوام بعض اوقات ربیع الاول کو بارہ وفات کا مہینہ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس مہینے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بارہ دن علیل رہے اور بارہ ربیع الاول کو آپ ﷺ نے وفات پائی۔ بارہ وفات کا نام بھی بادشاہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اگلے مہینے کو ربیع الثانی یا ربیع الآخر کہا جاتا ہے۔ ثانی کے لفظی معنی دوسرا ہوتے ہیں "آخر" (خ کے زبر کے ساتھ) جو اس نام کا جز ہے "دوسرے" کا مطلب رکھتا ہے لیکن لوگ اسے ربیع الآخر (خ پر زیر کے ساتھ) پڑھتے ہیں کیونکہ لفظ آخر (خاتمے کے معنی میں) زیادہ زبان زد ہے۔ اس مہینے کو بعض اوقات گیارھویں کا مہینہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اار ربیع الثانی کو پیران پیر حضرت عبد القادر جیلانی کا یوم وفات گیارہویں شریف کے نام سے منایا جاتا ہے۔

اسلامی کیلنڈر کے پانچویں اور چھٹے مہینے جُمادی الاولی اور جُمادی الاخریٰ کہلاتے ہیں۔ جُمادی میں میم پر پیش ہے اور یہ لفظ مونث ہے اس لیے اسکے ساتھ صفات بھی اپنی مونث شکل میں یعنی اولی اور اُخریٰ کا استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن اب عام طور پر جمادی کے جیم پر زبر کے ساتھ بولنے لگے ہیں اور ربیع الاول اور ربیع الآخر کے نمونے پر جمادی الاول اور جمادی

الآخر لکھااور پڑھا جانے لگا ہے۔

جُمادی کے معنی کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ایک تو یہ کہ اس کے معنی سخت اور بلند زمین کے ہیں کیونکہ ان دو مہینوں میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین کی خشکی بڑھ جاتی ہے اور زمین سخت اور کڑی ہو جاتی ہے۔دوسرا قیاس یہ ہے کہ جُمادی سردی پڑنے کی وجہ سے پانی جم جانے کی جانب اشارہ کرتا ہے لیکن عرب جیسے ریگستانی خطے میں برف جمنے کا اشارہ ناموزوں ہے۔

ساتواں مہینہ رجب ہے۔رجب ایک عربی لفظ سے بنا ہے جس کا مطلب تعظیم ہوتا ہے۔اسلام سے قبل عرب قبائل اسے خدا کا مہینہ کہا کرتے تھے اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ماہ صفر سے جمادی الاخری تک یہ قبیلے اکثر باہمی جھگڑوں اور جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے لیکن رجب کے مہینے میں وہ لڑائی بند رکھتے۔مسلمانوں کے لیے بھی یہ خیر و برکت کا مہینہ ہے۔اسی مہینے کے ستائیسویں (۲۷ ویں) تاریخ کو رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی معراج ہوئی تھی۔

اگلے مہینے شعبان کا نام "شعب" سے ہے جس کے معنی متفرق ہو جانے یا علاحدہ کرنے کے ہیں۔کیونکہ اس ماہ میں لوگ اپنے اونٹ لے کر ریگستان میں پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر نکل جاتے تھے اس لیے اسے شعبان کہنے لگے۔اس مہینے کو ہندستان میں بعض لوگ شب برات کا مہینا کہتے ہیں کیونکہ چودہ تاریخ کی رات کو شب برات کی شکل میں مانا جاتا ہے۔یہاں "برات" کے معنی "حصہ" کے ہیں۔یہ عقیدہ ہے کہ اس رات فرشتے اللہ کے حکم سے رزق کی تقسیم اور عمر کا حساب لگاتے ہیں' لفظ "شعب" جس سے شعبان بنا ہے اس کے ایک معنی علاحدہ علاحدہ کرنا بھی ہوتے ہیں اور یہاں اس سے حصہ کر کے تقسیم کرنے اور نصیب مقرر کرنے کی جانب اشارہ ہو سکتا ہے۔شعبان کو "شہر النبی" (یعنی نبی ﷺ کا مہینا) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اگلے مہینے یعنی رمضان میں تو عبادات کا نظام اللہ نے طے فرمایا ہے۔شعبان میں عبادات کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایات فرمائی ہیں۔رمضان جس طرح اللہ کا مہینہ ہے' ویسے ہی شعبان اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مہینہ ہے۔

رمضان کا نام "رمض" سے نکلا ہے جس کے معنی شدید گرمی اور جلانے کے

ہوتے ہیں۔ غالباً یہ ریگستان کی گرمی کے اس شدید موسم سے مطابقت رکھتا ہے جو اس مہینے میں اس کا نام رکھے جانے کے زمانے میں پڑتی ہو گی۔ رمضان روزوں نمازوں، عبادتوں، ریاضتوں، اپنے نفس پر سخت قابو رکھنے اور اپنے مال کو بتائے ہوئے طریقوں سے خرچ کرنے کا مہینہ ہے جو گناہوں کو جلا کر انسان کو کندن بناتا ہے۔

شوال ایک عربی لفظ سے مشتق ہے جس کا مطلب اونٹنی کا دم اٹھانا ہوتا ہے۔ اونٹنیاں جب بچہ دینے والی ہوتی ہیں تو اکثر اپنی دم اٹھاتی ہیں۔ چنانچہ شوال وہ مہینہ تھا جس کے خاتمے پر اونٹنیاں بچے دیا کرتی تھیں۔ شوال کے معنی اٹھ کھڑا ہونا اور چل پڑنا بھی ہیں۔ اس مہینے میں عرب سیر و شکار کے لیے گھروں سے نکل پڑتے تھے اور اگلے تین ماہ کے لیے اسباب یکجا کرتے تھے جن میں قتل و خونریزی کے ساتھ ساتھ شکار بھی حرام ہوتا تھا۔ عام لوگ اسے عید کا مہینہ کہتے ہیں، کیونکہ رمضان کا مہینہ ختم ہونے پر پہلی شوال کو عید الفطر منائی جاتی ہے۔ عید کے معنی ہیں جو لوٹ کر آئے۔ اس لیے عید کا مفہوم ایک ایسا موقع ہے جس کے لوٹنے کا ہم انتظار کریں جیسے کوئی تہوار۔ کیونکہ پہلی شوال کو منائی جانے والی عید مستحق لوگوں کو فطرہ ادا کر دینے کے بعد منائی جاتی ہے اس لیے عید الفطر کہلاتی ہے۔ ہندستان میں یہ میٹھی عید بھی کہلاتی ہے کیونکہ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ سوئیوں یا کسی دوسرے شیرینی سے مہمانوں کی خاطر داری کی جاتی ہے جو اس عید کو عید الاضحیٰ کے موقع پر تیار کیے ہوئے چٹ پٹے کھانوں سے ممتاز کرتی ہے۔

ذی قعدہ گیارھواں مہینہ ہے۔ عربی میں ذو قعدہ بیٹھنے والے کو کہتے ہیں۔ ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم ایسے تین مہینے تھے جن میں عرب قبائل جنگ و جدال کو حرام سمجھتے تھے ذیقعدہ کا مہینہ حج پر نکلنے سے پہلے بیٹھنے ستانے اور گھر پر رکنے کا مہینہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ اسے ذیقعدۃ الحرام کہا جاتا تھا اس لیے بعد میں لوگوں نے حرام مہینہ سمجھتے ہوئے اُسے منحوس مہینہ قرار دینا شروع کر دیا اور اس مہینے میں کوئی نیا کام شروع کرنا بُرا سمجھا جانے لگا۔ ہندستان میں تو عورتیں اس کا نام لینا بھی منحوس سمجھنے لگیں اور اسے خالی کا مہینہ کہا جانے لگا کیونکہ اس میں کوئی ایسی تقریب یا مصروفیت جیسے کہ شادی نہیں رکھی جاتی جس میں ناکامی کا اندیشہ ہو۔ کہتے ہیں کہ ذیقعدہ کو خالی کہنے کا رواج بھی ملکہ نور جہاں نے ہی ڈالا ہے۔

ذی الحجہ یعنی حج والا مہینہ اسلامی سال کا آخری مہینہ ہوتا ہے۔ اس مہینے کی نویں تاریخ کو عرفات میں خطبہ ہوتا ہے جو حج کے اہم ترین ارکان میں سے ہے۔ دسویں تاریخ کو عیدالاضحیٰ منائی جاتی ہے۔ اضحیٰ کا تعلق اس قربانی سے ہے جو ایک پہر دن چڑھے تک کی جاتی ہے۔ یہ قربانی اس قربانی کی یاد دلاتی ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم پر اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو زمین پر لٹادیا تھا اور رضائے الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی اس آمادگی کو قبول کرتے ہوئے اللہ نے فرشتوں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ایک دنبے کو رکھوادیا تھا۔ ہندستان میں عیدالاضحیٰ کو عیدالضحیٰ اور بقر عید بھی کہا جاتا ہے "بقرہ" عربی میں گائے کو کہتے ہیں۔ جن جانوروں کی قربانی کی جاسکتی ہے ان میں گائے بھی شامل ہے۔

مہینے سے بڑی اکائی سال ہے جس کے لیے عربی میں سنہ اور ہندی میں برس کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ سنہ کا لفظ تو اب اردو میں وقت کو شمار کرنے والے نظام کو بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے عیسوی سنہ یا ہجری سنہ۔ ہندی میں اس کے سم وت یا سمبت لاتے ہیں جیسے شک سموت یا وکرم سم وت۔ انگریزی میں سنہ کے عدد سے پہلے "اے ڈی" (A.D.) لکھ کر عیسوی سنہ اور "اے ' ایچ" لکھ کر ہجری سنہ بتایا جاتا ہے "اے ڈی" ANNO DOMINI کا مخفف ہے جس کا مطلب "ہمارے لارڈ یعنی حضرت عیسیٰ کے سال میں" ہوتا ہے عربی میں تو عیسوی سنہ کو میلادی سنہ کہا جانے لگا ہے لیکن یہودیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ حوالہ قبول نہیں اور بعض مواقع پر A.D. کی جگہ C.E لکھا جاتا ہے جو COMMON ERA یعنی عام سنہ کا مخفف ہے۔

برس جسے ہندی میں "ورش" کہتے ہیں "ورشا" یعنی برسات سے نکلا ہے "ورش" سے وہ عرصہ بتانا مقصود ہوتا ہے جو ایک برسات کے موسم سے دوسرے برسات تک پھیلا ہوتا ہے۔ دراصل خاص وقفے کے بعد موسموں کے لوٹنے کے مشاہدے سے انسان کو "سال" کی معنویت کا شعور ہوا اور یہی وجہ ہے کہ بعض دوسری زبانوں میں سال کا مفہوم رکھنے والے الفاظ میں موسموں کا مفہوم شامل ہے۔ جیسے انگریزی لفظ "یی ار" (Year) جس یونانی لفظ تک پہنچتا ہے اس کا مطلب موسم ہے اور جرمن ڈچ اور سویڈش زبانوں میں سال کو بتانے والے الفاظ ایسے الفاظ سے نکلے ہیں جن کا مطلب بہار ہوتا ہے۔ موسموں کی

سال بہ سال واپسی کے مشاہدے نے ہی اس اصول تک پہنچنے میں ہی مدد دی کہ زمین سورج کے گرد چکر لگارہی ہے اور اسی سے شمسی سال کی اہمیت کا پتا چلا۔

بابل میں علم نجوم کے جو نظریات وضع کئے گئے اُن میں اُن بارہ برجوں کا تصور خاص تھا جن سے ہو کر، جیسا کہ مانا جاتا تھا، سورج چاند اور دوسرے سیارے گذرتے تھے۔ ان میں بارہ برجوں کی بنیاد پر سال میں بارہ مہینوں کا تصور بھی پیدا ہوا اور پرانی دنیا کے بیشتر حصوں میں بارہ مہینے کا ایک سال مانا گیا۔ ہندستان کے وکرم سم وت میں البتہ قمری بنیادوں پر مقرر کئے گئے مہینوں کو شمسی سال کے مطابق بنانے کے لیے ہر تیسرے سال ایک زائد مہینہ کا اضافہ کرنے کا دستور ہوا۔

چینیوں نے سالوں کو پہچاننے کا الگ ہی طریقہ نکالا۔ انھوں نے بارہ بارہ سالوں کے نام بارہ جانوروں اور دوسرے جانداروں پر رکھے۔ ۱۹۹۶ء "شو" یعنی چوہے کا سال ہے۔ ۱۹۹۷ء "نیو" (بیل) کا ہوگا۔ ۱۹۹۸ء "ہو" (شیر)، ۱۹۹۹ء "سھو" (خرگوش)، ۲۰۰۰ء "لُنگ" (اژدھے)، ۲۰۰۱ء "شے" (سانپ)، ۲۰۰۲ء "ما" (گھوڑے)، ۲۰۰۳ء "یانگ" (بھیڑ)، ۲۰۰۴ء "ہو" (بندر)، ۲۰۰۵ء "چی" (مرغ)، ۲۰۰۶ء "کو" (کتے)، ۲۰۰۷ء "چو" (سور)، کے سال ہوں گے ان کے بعد اسی ترتیب سے پھر سنوں کے نام رکھ لیے جائیں جیسے ۲۰۰۸ء چوہے، ۲۰۰۹ء بیل، ۲۰۱۰ء شیر کے سال ہوں گے۔

سال کو مختلف موسموں کے اعتبار سے بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ موسم سرما، موسم گرما، بہار، خزاں، برسات یا مانسون کا موسم۔ فصلوں کے اعتبار سے ربیع یا خریف کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ بہار تو خیر سرسبزی اور شادابی، سبز پتیوں اور رنگ برنگے پھولوں کا موسم ہے لیکن خزاں پیلی پتیوں اور پت جھڑ کا موسم ہے جو آگاہ کرتا ہے کہ سردی سر پر آپہنچی ہے۔ لفظ خزاں کے بارے میں دو نظریے ہیں، ایک تو یہ کہ اس کی اصل فارسی مصدر خزیدن سے ہے جس کا مطلب گھسنا، چھپنا ہوتا ہے۔ اسے اس جانب اشارہ ہے کہ اس موسم میں کیڑے مکوڑے درختوں کی چھال چھیل چھیل کر یا زمین کو کھود کر موسم سرما کی سختی اور برف باری سے بچنے کے لیے اپنے سوراخ اور بل بنانے لگتے ہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ "خزاں"، لفظ "خز" سے نکلا ہے۔ خز ایک قسم کی پوستین ہوتی ہے جسے جسم کو

گرم رکھنے کے لیے پہنا جاتا ہے۔ اس طرح خزاں کا مفہوم ایک ایسا موسم ہوا جس میں لوگ گرم کپڑے پہننے لگتے ہیں۔

ہندستان کی موسموں کی ایک خصوصیت یہاں کی مانسونی بارش ہے مانسون کی اصل عربی لفظ "موسم" ہے۔ وہ عرب جہاز راں جو بحیرۂ عرب میں اپنے جہاز لے کر آتے تھے ان کو ان طوفانی موسمی ہواؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو گرمی میں ایک سمت اور سردی میں دوسری سمت میں چلتی تھیں۔ صیغہ جمع میں وہ ان ہواؤں کو "موسمیون" کہتے تھے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں جب پرتگالی جہاز راں بحر ہند پہنچے تو ان ہواؤں کے لیے عربی لفظ "مان ساوں" کی شکل میں اپنالیا ڈچ لوگوں کی معرفت انگریزوں تک پہنچتے پہنچتے یہ لفظ مانسون ہو گیا۔

جہاں تک فصلوں کا تعلق ہے، ربیع کا لفظ عربی میں موسم بہار کے لیے آتا ہے۔ ہر ۲۱/ مارچ سے شمالی نصف کرے میں سورج کی کرنیں سیدھی ہونے لگتی ہیں اور گرمی بڑھتی جاتی ہے اس سے وہ فصل جو سردی سے پہلے بوئی گئی تھی پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ اس طرح موسم بہار کی آمد کے بعد کاٹی جانے والی فصل ربیع کی فصل کہلاتی ہے۔

وہ فصل جو ہندستان میں جون جولائی میں بوئی اور اکتوبر کے قریب کاٹی جاتی ہے خریف کی فصل کہلاتی ہے۔ حقیقت یہ کہ خریف کا لفظ ہندستانی موسم اور فصلوں کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ خریف کے معنی ہوتے ہیں میوہ چننا۔ شمال میں میوہ خزاں کے موسم میں پکتا ہے اور نومبر میں جاڑا شروع ہونے سے پہلے چن لیا جاتا ہے۔ ہندستان میں خزاں اور جاڑے کی یہ شکل نہیں ہے لیکن تُرک اپنے ساتھ فصلوں کو بیان کرنے کے لیے جو الفاظ لائے تھے وہ انھوں نے ہندستان میں استعمال کئے اور اکتوبر میں کاٹی جانے والی فصل کو خریف کہا جانے لگا۔

کوئی واقعہ کب ظہور میں آیا یہ بتانے کے لیے تاریخ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک دن اور ایک رات کو ملا کر ایک تاریخ بنتی ہے۔ یہ تاریخ کبھی صرف ایک عدد ہوتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ مہینے کے دنوں کا شمار رکھا جائے تو وہ کون سے نمبر کا دن ہے۔ لیکن بیان کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے اکثر مہینے کے نام کو بھی شامل کر دیا جاتا ہے اور اس کو مکمل کرنا ہے تو آخر میں سنہ بھی جوڑ دیتے ہیں۔ تاریخ ایک عربی لفظ ہے لیکن اس کی اصل ایک ایسا

عبرانی لفظ ہے جس کے معنی مہینہ ہوتے ہیں۔ یعنی اصلاً تاریخ ایک زیادہ وسیع عرصۂ زمانی کو ظاہر کرتی ہے اور یہی بات تاریخ کے لفظ کے دوسرے استعمال میں دکھائی دیتی ہے جہاں تاریخ کو ہسٹری کے معنی میں لیا جاتا ہے اور اس سے ایک طویل عرصے پر پھیلے ہوئے واردات وحادثات کا بیان مطلوب ہوتا ہے۔

تاریخوں کا حساب رکھنے کے لیے جس قسم کی فہرستیں اور یادداشتیں بنائی جاتی ہیں ان میں چار لفظوں پر غور کیا جاسکتا ہے 'کیلنڈر' جنتری' تقویم اور ڈائری۔

کیلنڈر شروع میں بنئے کا بہی کھاتہ ہوتا تھا۔ رومن لوگ مہینے کے پہلے دن کو کیلنڈس کہتے تھے۔ خود کیلنڈس ایک لاطینی لفظ سے نکلا تھا جس کے معنی "پکار" کے ہوتے ہیں۔ قدیم روم میں یہ رواج تھا کہ حکومت کے فرمانوں اور قوانین کے بارے میں لوگوں تک شروع مہینے میں ڈھنڈورچی کے ذریعے اطلاع پہنچادی جاتی تھی۔ ساہوکار جو اُدھار دیتے تھے اس پر مہینے کے پہلے دن سود چڑھتا تھا اور اس کا حساب وکتاب وہ اپنی بہی کھاتے میں جسے وہ کیلنڈریم کہتے تھے درج کرلیا کرتے تھے۔ یہ حساب ماہ بماہ تیار ہوتا رہتا تھا۔ سال بھر کی تفصیلات بتانے والی فہرستوں کو خاص طور پر گرجا گھروں میں رواج دیا گیا۔ گرجا گھروں میں لٹکائی جانے والی ان فہرستوں میں یہ بتایا جاتا تھا کہ کون سی تاریخ کس مذہبی پیشوا کی نسبت سے مقدس ہے۔ کن کن تاریخوں میں تہوار پڑیں گے اور خاص مذہبی رسوم ادا کی جائیں گی۔ ان فہرستوں میں مقدس دنوں کو سرخ رنگ سے دیکھایا جاتا تھا۔ اسی بنیاد پر انگریزی میں کسی غیر معمولی اہمیت کے دن کو "ریڈ لیٹر ڈے" یعنی لال حروف میں لکھا دن کا محاورہ بن گیا اور یہ مقدس دن (Holy day) انگریزی میں چھٹی کے لیے بولا جانے والا لفظ ہالی ڈے (Holiday) بن گیا۔

جنتری اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں الگ الگ مہینوں کی تاریخوں اور دنوں کی مطابقت کے ساتھ ' ستاروں کی پوزیشن 'اہم تقریبات اور تہواروں وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے جنتری کا لفظ "ینتر" سے نکلا ہے۔ "ینتر" کے سادہ معنی اوزار اور آلات کے ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں ان پیمائش کے آلات کی بات ہے جو ستاروں کے پوزیشن معلوم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسی تعمیرات جو جیوتش کا حساب لگانے کے لیے بنیادی معلومات فراہم کرنے میں مدد کرتی ہیں انھیں بھی جنتر منتر کہا جاتا ہے۔

تقویم کا لفظ اسی عربی مادّے سے نکلا ہے جس سے قائم اور قیام۔ اس کے معنی سیدھا کھڑا ہونے کے ہیں اور اس لفظ کو متفرق چیزوں کو منظم کرنے اور ان میں ترتیب لانے اور آپس میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ تقویم بھی جنتری کی طرح تاریخ، دنوں اور ستاروں وغیرہ کی حالت میں باہمی مطابقت پیدا کرتی ہے۔

ڈائری کا لفظ ایک ایسی کتاب کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں تاریخ وار یادداشتیں رکھی جاتی ہیں۔ حالانکہ اس لفظ کا تعلق لاطینی زبان میں "دن" کے لیے استعمال ہونے والے لفظ سے ہے، شروع میں اس کے معنی بالکل الگ نوعیت کے تھے۔ ڈائری سے وہ حصہ مراد ہوتا تھا جو کسی کو روزانہ خوراک یا اُجرت کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ یعنی اس کا حساب کہ کسی مزدور یا ملازم کو کتنی خوراک یا پیسہ روزانہ دیا جائے گا۔ بعد میں یہ لفظ اس یادداشت کے لیے بولنے لگے جو اس لوگوں کے نام کے ساتھ اس قسم کی تقسیم کو بتاتی تھی اور اسی نے ڈائری کے موجودہ استعمال کی شکل لی۔ سترھویں سے انیسویں صدی تک ڈائری کا لفظ انگریزی میں "صرف ایک دن چلنے والے" کے مفہوم میں بھی بولا جاتا رہا۔

براعظموں اور ملکوں کے نام

دنیا کے سات براعظموں میں سب سے بڑا ایشیا ہے۔ لیکن اس کے نام کے لیے ہمیں قدیم یونانیوں کی نظر سے دیکھنا ہوگا۔ یونانیوں کی حکومت کا سب سے اہم حصہ وہ تھا جو اب ایشیائی ترکی کہلاتا ہے۔ یہ ایک طرح یونان کا مشرقی صوبہ تھا۔ اس کا قدیم نام اَش شوؤا تھا۔ جو قدیم عکادی زبان کے لفظ ''اَشو'' سے نکلا تھا جس کے معنی نکلنے اور طلوع ہونے کے تھے۔ گویا یہ خطہ زمین ان کے لیے طلوع آفتاب کی دھرتی تھی۔ جب یونان کے حکمران مشرق کی جانب اپنی فوجیں لے کر بڑھے تو انھیں اس کا اندازہ ہوا کے دنیا اس سمت میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس پوری سرزمین کو ایشیا کہنا شروع کردیا اور ایک وقت ایسا آیا جب مشرق کی طرف پھیلے ہوئے پورے علاقے کو ایشیا کہا جانے لگا اور ایشیائی ترکی محض ایشیائے کوچک (ASIA MINOR) رہ گئی۔ یونان نے دنیا کو جس نظر سے دیکھا تھا اس کا اثر آج بھی ہے۔ یونان کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے ایشیائی علاقوں کو مشرق اور یوروپ اور امریکہ کے حصوں کو مغرب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یونان سے قربت کو مدنظر رکھتے ہوئے شام، اردن اور لبنان وغیرہ کو مشرق وسطیٰ اور یونان سے دوری کے باعث جاپان اور چین وغیرہ کو مشرق بعید کہا جاتا ہے۔

لفظ ''یوروپ'' کی اصل فنیقی زبان کا ایک لفظ ''اے رے بو'' مانا جاتا ہے جس کا مطلب گرنا ہوتا ہے۔ غالبًا اسی لفظ نے عربی میں ''غرب'' کی شکل اختیار کی اور غروب اور مغرب کے الفاظ بنے۔ اس طرح یہ لفظ سورج کے ڈوبنے سے متعلق ہوگیا۔ یونانی اور مصری جہازرانوں کی ساری سیاحت اس وقت بحیرۂ روم کے اندر اندر ہی محدود تھی۔ اسپین سے آگے بحر اٹلانٹک انھیں لامحدود لگتا تھا اور اسے انھوں نے اوقیانوس کا نام دیا تھا جو ان کے خیال کے مطابق ایک ایسا سمندر تھا جس نے پوری دنیا کو گھیر رکھا تھا۔ اور اسی میں سورج نیچا ہوتے ہوتے آخرکار ڈوب جایا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ بحیرۂ روم کے مغربی سرے کے

قریب بسے ہوئے اسپین اور فرانس وغیرہ کے علاقوں کو مغربی علاقہ یا یوروپ کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ نام پورے براعظم سے وابستہ ہو گیا۔

یہ مغربی حصہ یونانیوں کی نظر میں کس قدر دلکش تھا اس کا اندازہ یونانی دیومالا میں یوروپا نام سے موسوم ایک حسین شہزادی کی کہانی سے ہوتا ہے جو اس قدر خوبصورت تھی کہ اس پر نظر پڑتے ہی سب سے بڑا دیوتا زی اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ زی اس نے ایک خوبصورت بیل کی شکل اختیار کی اور یوروپا کے پاس پہنچ کر اسے اس طرح رجھایا کہ وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ گئی اور تب زی اس یوروپا کو لے اڑا اور اسے کریٹ کے جزیرے میں جا کر رکھا۔ یوروپا نے جن بیٹوں کو جنم دیا وہ بعد میں حق وانصاف کی مثال بنے۔

موجودہ نظریہ یہ ہے کہ یوروپ کے لفظی معنی اصل برّی علاقہ (Main land) ہے۔ غالباً بحیرۂ روم کے مشرقی حصے میں واقع بحیرۂ ایجین کے جزیروں میں رہنے والے یونانیوں اور دوسرے جہاز رانوں نے اٹلی، فرانس اور اسپین کے ان ساحلی علاقوں کے پیچھے واقع بسیط خطۂ ارض کا نام یوروپ رکھا جہاں یہ اپنے جہاز اور کشتیاں لے کر پہنچتے تھے۔

جنوب میں یہ لوگ افریقی ساحل پر واقع مقامات پر جایا آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی ساری معلومات شمالی افریقہ تک محدود تھی۔ قدیم یونانی دریائے نیل کے مغرب میں واقع شمالی افریقہ کے حصوں کو لیبیا کہتے تھے۔ یہ نام انھوں نے مشرقی سرے نائیکا میں ڈیڑھ ہزار قبل مسیح کے قریب آباد ایک قبیلے کے نام پر رکھا تھا۔ "افریقہ" کے نام کا انتخاب رومن لوگوں نے کیا جو وہ اس براعظم کے شمالی ساحل پر واقع اپنے صوبے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لفظ افریقہ کی اصل یا تو لاطینی لفظ "اپ ری کا" تھا جس کا مطلب "دھوپ والا" ہوتا ہے یا یونانی لفظ "افریکے" تھا جس کا مطلب "بلا ٹھنڈک والا" ہوتا ہے۔ افریقہ کا لفظ اس طرح اپنے اندر "گرم ملک" کے معنی رکھتا ہے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ رومن لوگ اپنے صوبے کے جنوب میں واقع علاقے کو "افریگا" یعنی افریگ لوگوں کا دیس کہتے تھے۔ افریگ لوگ کارتھیج کے جنوب میں آباد ایک بربر قبیلے کا نام تھا۔

شمالی افریقہ میں واقع بسیط وعریض صحارا کے ریگستان اور پھر وسطی افریقہ کے خط استوا پر واقع ہونے کی وجہ سے گھنے جنگلوں، دشوار گذار دریاؤں اور پہاڑوں نے اور اس کے

علاوہ باہری دنیا کے لوگوں کو قبول نہ کرنے والے جنگلی قبائلیوں نے افریقہ کو یوروپ والوں کی پہنچ سے باہر رکھا اور وہ اس کو تاریک براعظم کی مثال دینے لگے لیکن افریقہ کا لفظ صرف شمالی حصے تک محدود نہ رہا بلکہ دھیرے دھیرے اس سے پورا براعظم مراد لیا جانے لگا۔

امریکا کے ساتھ شروع سے غلط فہمیاں جڑی رہیں۔ کرسٹفر کولمبس نے جب بحر اٹلانٹک پار کرنے کا منصوبہ بنایا تو اس کا خیال تھا کہ وہ ہندستان پہنچنے کا نیا راستہ معلوم کرنے جارہا ہے۔ چنانچہ جب اس نے نئی دنیا پر قدم رکھا تو سمجھا کہ وہ ہندستان کی سرزمین پر پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ اس علاقے کو انڈیز کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ بعد میں اسے اصل ہندستان سے ممتاز کرنے کے لیے ان جزائر کو ویسٹ انڈیز کہنے لگے۔ اسی غلط فہمی کی بنیاد پر اس دنیا کے باشندوں کو انڈین کہنے کا رواج ہوا۔ غلطی کا احساس ہونے پر ان لوگوں کی رنگت کے مد نظر ان کو ریڈ انڈین کہنا مناسب سمجھا گیا۔

امریکا کا نام تو ایک اور سنگین غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کرسٹفر کولمبس کو یہ اعزاز ملتا کہ اس کے نام سے اس خطۂ ارض کو پہچانا جائے۔ مگر یہ نام ایک دوسرے ہی جہاز راں کی یاد دلاتا ہے۔ اطالوی جہاز راں امریگو ویس پچی نے یہ دعوا کیا کہ اس نے کولمبس کے بعد نئی دنیا کے چار سفر کئے تھے۔ اس کے بارے میں اس نے نہ صرف دلچسپ کہانیاں لکھیں بلکہ یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ یہ دنیا کولمبس کے خیال کے برخلاف ایشیا کا حصہ نہیں بلکہ ایک جُداگانہ براعظم ہے۔ ان قصوں کا والڈزے میولر نے جرمن زبان میں ترجمہ کیا اور اس کے ساتھ ایک نقشہ بھی چھاپا جس میں موجودہ جنوبی امریکا کے علاقے دکھائے گئے تھے۔ اس نقشے میں پہلی بار ۱۵۰۷ء میں امریکا کا نام استعمال ہوا تھا۔ ۱۵۲۸ء میں مشہور نقشہ ساز مرکے ٹر نے پہلی بار امریکا کا لفظ شمالی اور جنوبی امریکا کے دونوں براعظموں کے لیے استعمال کیا۔ مزے کی یہ بات ہے کہ اب بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اطالوی جہاز راں امریگو کبھی امریکا کی سرزمین پر پہنچا ہی نہیں اور اس نے اپنی کہانیاں صرف سنے سنائے قصوں کی بنیاد پر لکھی تھیں۔ نئی دنیا کی دریافت کا اعزاز حاصل کرنے کی کوشش میں انگریز بھی پیچھے نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کا نظریہ ہے کہ امریکا کا نام رچرڈ امریک (RICH-ARD AMERYK) کے نام پر ہے جو انگلستان کے شہر برسٹل کا شیرف (Sheriff) تھا اور

اس نے جان کے بٹ کے سمندری سفر کے خرچ کا انتظام کیا تھا۔ جان کے بٹ جو ایک اطالوی جہاز راں تھا حکومت انگلستان کی ملازمت میں تھا اور اس نے بادشاہ ہنری ہفتم کی سرپرستی میں شمالی راستے سے ہندستان پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں اس کے بیٹے بیس ٹی ان نے ۱۴۹۷ء میں شمالی امریکہ کا علاقہ لیبراڈور دریافت کیا تھا۔ لہذا یہ امر ابھی بھی معما بنا ہوا ہے کہ امریکا کا نام کس کے نام پر ہے۔

آسٹریلیا کے نام کے ساتھ بھی ملکوں کی باہمی رقابتیں جڑی ہوئی ہیں۔ یہ بات کہ جنوب میں کوئی خطۂ زمین ہے لوگوں نے سنگاپور اور ملایا کے ان ملاحوں سے سنی تھی جو جنوبی سمندروں میں بھٹکنے کے بعد لوٹے تھے۔ چین کے راستے یہ اطلاع قرونِ وسطیٰ میں یوروپ تک پہنچی تھی۔ چنانچہ قدیم نقشوں میں جنوبی حصہ خالی چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس پر Terra australis incognita (لا معلوم خطۂ زمین) لکھ دیا جاتا تھا۔ ۱۶۴۴ء میں ایسٹ انڈیز کے ڈچ جنرل گورنر اور جہاز راں ابیل ٹسمان نے اپنے دوسرے بحری سفر کے دوران آسٹریلیا کے شمالی ساحل کو دیکھا اور اس کا نام نیو ہالینڈر رکھا۔ بعد میں انگریز بحریہ کے افسر میتھیو فلنڈرس نے پورے ساحل کا نقشہ تیار کیا۔ اسے اس خطۂ زمین کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ فلنڈرس کو نیو ہالینڈ نام قبول نہیں ہوا اور اس علاقے کا نام Terra australis in-cognita کو مختصر کر کے آسٹریلیا رکھنا تجویز کیا جسے ۱۸۱۷ء میں سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اس طرح آسٹریلیا کے معنی "جنوبی" ہوئے۔

قطب جنوبی کے گرد پھیلا ہوا براعظم انٹارکٹکا رقبے میں یوروپ اور آسٹریلیا سے بھی بڑا ہے لیکن اس کا نام بھی اپنا نام نہیں ہے اور اپنی معنویت کے لیے قطب شمالی کا مرہونِ منت ہے۔ انٹارکٹک کے معنی ہیں "آرکٹک کے برعکس" خود آرکٹک کا تعلق ایک یونانی لفظ سے ہے جس کا مطلب "ریچھ" ہے۔ ریچھ سے یہاں دبِّ اکبر اور دبِ اصغر نام کے وہ تاروں کے جھرمٹ مراد ہیں جو شمال میں قطب تارے کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ غالب نے اپنے ایک شعر میں ان ستاروں کے لیے رائج ایک اور اصطلاح "بنات النعش" استعمال کی ہے۔ اس طرح انٹارکٹکا ایک ایسا علاقہ ہے جو کرۂ ارض کی دوسری طرف آرکٹک کے مقابل پڑتا ہے۔

بعض ناموں کی اصل دریافت کرنے کے دوران بھی بڑے عجیب و غریب پہلو

سامنے آتے ہیں۔ جاپان کے ہی نام کو لے لیجئے۔ آج کل جاپان کا بنا ہوا مال، خاص طور پر الکٹرانک کا سامان بڑی معتبر کوالٹی کا مانا جاتا ہے۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کا زمانہ بھی یاد آتا ہے جب جاپانی مال نقلی اور کمزور سمجھا جاتا تھا اور اصل مال کے مقابلے میں سستے داموں میں مل جایا کرتا تھا۔ حال یہ ہے کہ اس وقت ملک جاپان کا بین اقوامی نام بھی جاپانی یعنی نقلی ہے کیونکہ اہل جاپان اپنے ملک کو جاپان نہیں نپان کہتے ہیں۔ دراصل جاپان کا لفظ یوروپ والوں نے چینیوں سے لیا ہے جو نپان کو جے پن کہتے ہیں۔ اس کا مطلب طلوع آفتاب ہوتا ہے۔ نپان سے بھی طلوع آفتاب مراد ہے کیونکہ قدیم زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ جاپان کے مشرق میں جو ناقابل عبور سمندر ہے اسی میں سے ہر صبح سورج بر آمد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان کو ہی طلوع آفتاب کی دھرتی کہا جاتا ہے اور جاپان کے جھنڈے پر لال سورج کا نشان ہے۔

آٹھویں صدی کے قریب جاپان کا نام اکت سُورشی ما تھا جس کا مطلب ہوتا ہے جھنبھیری جزیرہ۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ جاپان کے بڑے جزیرے کی شکل جھنبھیری جیسی لگتی تھی۔

کوریا کو اس ملک کے باشندے چسُون کہتے ہیں جس کا مطلب صبح کے سکون کا دیس ہوتا ہے۔ مغرب میں استعمال ہونے والا نام یعنی "کوریا" کوریو نامی ایک حکمراں خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس نے ۹۱۸ء سے ۱۳۹۳ء تک حکومت کی۔ لفظ کوریا کا مطلب "بلند وخوبصورت" ہوتا ہے۔

چین اس وقت سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے۔ لیکن ایک زمانے میں "چ۔ان" کے نام کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ ۲۲۱ قبل مسیح میں یہاں کے حکمراں چنگ نے قریب کے دوسری ریاستوں کے حکمرانوں کو شکست دے کر اپنی سلطنت قائم کر لی اور پورے علاقے کا نام چین پڑ گیا۔ اس "چ۔ان" خاندان نے ۲۵۵ سے ۲۰۷ قبل مسیح تک حکومت کی اور اسی وجہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چین کا نام اس شاہی خاندان کے نام پر ہے۔ موجودہ انداز تحریر میں چین کے نام کو ژانگ گو اُو لکھا جاتا ہے جس کا مطلب "وسطی علاقہ" ہوتا ہے۔ شمالی حصے میں جسے "خطا" (CATHAY) کہتے تھے مختلف وقتوں میں دوسری حکومتیں رہیں۔ اس حصے کے وسطی ایشیا کے علاقوں کے ساتھ اچھے تجارتی

تعلقات تھے اور وہاں سے کئی اشیا ہندستان بھی پہنچتی تھیں اور ان میں کچھ کی خطا سے نسبت صاف دکھائی دیتی تھی جیسے نان خطائی اور اجوائن خطائی وغیرہ۔

تائے وان پر چین کا دعوا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں اس جزیرے پر پرتگالی پہنچے اور انھوں نے اسے فارموسا کا نام دیا جس کے معنی "خوبصورت جزیرہ" ہوتے ہیں۔

تبت اب چین کا حصہ ہے۔ اس کا نام غالباً وہاں کے ایک راجا ٹوپاٹ کے نام پر تھا جو عربوں کی معرفت یوروپ پہنچتے پہنچتے تبت ہو گیا۔

ہانگ کانگ کو چینیوں نے ۱۸۴۲ء میں انگریزوں کے حوالے کیا تھا اور ۱۹۹۷ء میں چین کو دوبارہ واپس لوٹا دیا جائے گا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کا چینی نام ہیانگ کیانگ تھا جس کا مطلب "موافق پانی" یا اچھا بندرگاہ ہوتا ہے۔ اس کا ایک اور مفہوم "جلانے والے خوشبودار مسالے کا بندرگاہ" بھی بتایا جاتا ہے۔

نیپال کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں پہلے "نے پا" نامی ذات کے لوگ رہتے تھے۔ یہ اب بھی نیپال کے بعض حصوں میں رہتے ہیں اور نے وار کہلاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اس ملک کا نام نیپال پڑا۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ "نے" کے معنی پاک کے ہوتے ہیں اور "بال" سے "اون" مراد ہے۔ نیپال اپنے اچھے اون کی وجہ سے مشہور ہے چنانچہ اسے پہلے "نے بال" اور پھر نیپال کہا گیا۔

بھوٹان کے نام کی اصل کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ ایک تو یہ کے یہاں کے اصل باشندے بھوٹیا قبیلے کے لوگ ہیں اس لیے اسے بھوٹان کہا جاتا ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ بھوٹان دو لفظوں "بھیوٹ" جو تبت کا ایک نام ہے اور "انت" جس کا مطلب خاتمہ ہوتا ہے مل کر بنا ہے کیونکہ بھوٹان تبت کی سرحد پر واقع ہے۔ بھوٹان کا سرکاری نام "ڈرک یل" یعنی سلطنت بھوٹان ہے۔

برما نے ۱۹۸۹ء میں "میاں مار" نام اختیار کیا۔ دراصل یہ اس ملک کا قدیم ترین نام ہے جو "میاں" یعنی تیز اور "مار" یعنی طاقتور سے مل کر بنا ہے۔ برما کے لوگ جس طرح اس نام کا تلفظ کرتے تھے اس کی بنا پر یوروپ والے اسے "برما" کہنے لگے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بدھ مذہب کی قدیم پالی تحریرات میں "برام ما" نامی ایک قوم کا ذکر ملتا ہے، جسے دنیا میں نیک لوگوں کی پہلی قوم بتایا گیا ہے۔ چنانچہ جب بالائی برما کے باشندوں نے بدھ مذہب

قبول کیا تو انھوں نے خود اپنے اور اپنے علاقے کے لیے "برام ما" کا لفظ اختیار کرنے میں فخر محسوس کیا۔ ہندستان میں اس کو برہم دیش کے نام سے موسوم کیا گیا اور بعد میں اس کے لیے "برہما" کا مختصر نام استعمال میں آیا۔ اکبر الہ آبادی نے بھی اپنی ایک نظم میں اس ملک کو "برہما" کے نام سے پکارا ہے۔

تھائی لینڈ کو پہلے سیام کہا جاتا تھا۔ تھائی نسل کے لوگ برما، تھائی لینڈ، لاؤس وار پڑوسی ملکوں میں رہتے ہیں۔ اس نسل کی دو خاص شاخیں تھیں۔ ایک تھائی پائی یعنی بڑے تھائی اور دوسری تھائی نوئے یعنی چھوٹے تھائی۔ بڑے تھائی زیادہ تر برما کے باشندے تھے اور ان کو برما میں شان کہا جاتا تھا۔ (بڑے تھائی کی ہی ایک شاخ آہوم کے نام سے مشرقی ہندستان میں پھیلی اور اسی کے نام پر آسام کا علاقہ کا نام پڑا)۔ شان کو "سی ان" بھی کہا گیا اور اسی "سی ان" نے سیام کی شکل اختیار کی۔ اس طرح تھائی لینڈ کے چھوٹے تھائیوں نے خود کو بڑے تھائیوں کے ساتھ وابستہ کرنا چاہا لیکن اب اس ملک کے لوگ چھوٹے بڑے تھائی کے فرق کو دور کر کے خود کو صرف تھائی کہلانا پسند کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اپنے ملک کو تھائی لینڈ کا نام دیا۔ سیام کے نام کے بارے میں ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ملایا کی زبان کے ایک ایسے لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی "سانولے یا کالے" کے ہوتے ہیں۔ اور کیونکہ تھائی لینڈ کے لوگ برما وغیرہ کے باشندوں سے زیادہ گہرا رنگ رکھتے تھے اس لیے ان کے ملک کو سیام کہا گیا۔ سنسکرت لفظ شیام سے بھی کم و بیش یہی معنی نکلتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں سیام کا سرکاری نام بدل کر "پراتھس تھائی" (تھائی لینڈ) رکھا گیا جس کے معنی "آزاد لوگوں کا دیس" ہوتے ہیں۔

لاؤس جمع ہے "لاو" کی۔ لاؤ لوگ تھائی نسل سے ہی تعلق رکھتے تھے جو آٹھویں صدی میں جنوبی چین سے منتقل ہو کر یہاں آئے تھے۔ چینی میں "لاو" بوڑھے یا بزرگ کو کہتے ہیں۔

کمبوڈیا کا قدیم مقامی نام کمپوچیا ہے۔ اس کی اصل سنسکرت لفظ "کمبوجا"۔ پرتگالیوں نے اس لفظ کو Comboja لکھا دیکھا اور حرف "ج" کا تلفظ "ی" کرتے ہوئے اس علاقے کو Camboia بولنے لگے جس نے کچھ عرصے کے بعد کمبوڈیا کی شکل اختیار کر لی۔ کمبوج نام کا ایک علاقہ غیر منقسم ہندستان کے شمالی مغربی حصے میں چترال اور کافرستان کے

علاقوں میں واقع تھا۔ یہ روایت ہے کہ ہندستان سے گئے ہوئے کونڈی نئے نامی ایک برہمن نے کمبوڈیا کی شہزادی شوبھا سے شادی کر لی اور اس طرح دوسری صدی عیسوی میں ہندستان نسل کی ایک شاہی خاندان کی ابتداء ہوئی۔ اس وقت اس علاقے کا چینی نام فونان تھا جو چھٹی صدی میں کم بج دیش ہو گیا۔ اس خاندان کے راجاؤں نے اس علاقے میں ہندستانی تہذیب کے شاندار نقوش اپنے پیچھے چھوڑے۔ ان میں انکورواٹ کا مشہور مندر بھی ہے جو اس وقت عالمی ثقافتی وراثت کا حصہ ہے اور یونیسکو اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتی ہے۔ ہندستانی نسل کے اس شاہی خاندان نے کمبوڈیا میں پندرھویں صدی تک راج کیا۔ سنسکرت میں کمبوج ایک قسم کے ہاتھی کو کہتے ہیں اور کیونکہ اس علاقے میں ہاتھی کو مذہبی اعتبار سے خاص احترام حاصل تھا اس لیے بھی اس نام کو ترجیح دی گئی ہوگی۔ ہاتھی کو اس نواح میں جو اعلیٰ مقام دیا جاتا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سیام میں شاہی جھنڈے پر ہاتھی کی شکل بنائی جاتی تھی۔

فلپائن کو ۱۵۲۱ء میں پرتگالی جہاز راں فرڈی نینڈ ے جے لن نے جو اس وقت حکومت اسپین کا ملازم تھا دریافت کیا۔ ۲۱ سال بعد ایک بحری کھوج کرنے والی اسپینی ٹیم نے اس کو اسپین کے فرمانروا فلپ دوم سے منسوب کرتے ہوئے اس کا نام فلپائن رکھا۔

انڈونیشیا دنیا کا سب سے بڑا مجمع الجزائر ہے۔ سولھویں صدی میں مسالوں کی تجارت کے لیے پرتگالیوں نے چند جزیروں پر قبضہ کیا لیکن انگریزوں نے پرتگالیوں کو نکال بھگایا۔ ۱۵۹۵ء میں یہ جزیرے ڈچ لوگوں کے قبضے میں آئے اور انھیں ڈچ ایسٹ انڈیز یعنی ڈچ جزائر شرق الہند کا نام دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں ایک جرمن جغرافیہ داں نے انھیں انڈونیشیا کا نام دیا جس کا مطلب "ہندی جزائر" ہے۔ (یونانی میں Nesos جزیرے کو کہتے ہیں) لیکن یہ نام اس ملک کے ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہونے کے بعد ہی رائج ہوا۔

نیوزی لینڈ کا نام سن کر قدرتی طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ کوئی پرانازی لینڈ بھی ہوگا اور یہ بات صحیح بھی ہے۔ کیونکہ زی لینڈ نیدر لینڈس کا ایک صوبہ ہے۔ نیوزی لینڈ کو ۱۶۴۲ء میں نیدر لینڈس کے ایک باشندے ابیل ٹسمان نے دریافت کیا تھا اور شروع میں اس کا نام Staten Landt رکھا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ جنوبی امریکا کے جنوب ترین سرے پر پہنچ گیا ہے اور جس زمین کو دیکھا ہے وہ اس سرے پر واقع اسٹاٹن نامی جزیرے کے

پیچھے واقع اصل براعظم کا حصہ ہے۔ لیکن جب اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ابھی جنوبی امریکہ نہیں پہنچا ہے تو اس نے اس حصے کا نام NOVA ZEELANDIA رکھا۔ اب اس کا انگریزی ترجمہ نیوزی لینڈ رائج ہے لیکن ترجمے کے بعد زی لینڈ کے ہجوں میں فرق ہو گیا۔ اب نیوزی لینڈ میں "زی" ZEA لکھا جاتا ہے۔ جب کہ جو نام تسمان نے تجویز کیا تھا اس میں "زی" ZEE تھا ہجے کے فرق سے "زی لینڈ" کے حوالے میں بھی فرق آگیا کیونکہ ZEA LAND پڑوسی ملک ڈنمارک میں جزیرہ نما جٹ لینڈ کے مشرق میں واقع ڈنمارک کا سب سے بڑا جزیرہ ہے اور اسی پر ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن واقع ہے۔ تسمان کو ڈنمارک کے جزیرے کا حوالہ مطلوب نہیں تھا۔ تسمان کے وطن میں واقع ZEELAND میں ZEE کے معنی سمندر کے ہیں اور ZEELAND کا مطلب وہ زمین ہے جو پہلے سمندر کی تھی۔ نیدر لینڈس میں سمندر میں پشتے باندھ کر اور سمندر کا پانی پشتے کے پیچھے پھینک کر بہت سی زمین نکالی گئی ہے جو کہ سطح سمندر کے نیچے ہے اور اسی بنا پر اس ملک کا نام نیدر لینڈس یعنی نیچے کی زمین ہے۔

سنگاپور کا نام چودھویں صدی تک تماسک تھا۔ جاوا کی زبان میں "تاسک" سمندر کو کہتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ چودھویں صدی میں چول راجا راجیندر نے سنگاپور نام رکھا۔ سنگا پور کے لفظی معنی "شیروں کا شہر" ہیں۔ یہ نام غالباً بدھ بھکشوؤں کی تجویز پر رکھا گیا تھا کیونکہ وہ شیر کو کردار کی اعلا خصوصیات کی علامت کے طور پر مانتے تھے۔

شری لنکا کے نام نے بڑے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ تیلیگو زبان میں "لنکا" کا مطلب جزیرہ ہے۔ اس سے ساحل سمندر یا ندی کے کنارے آباد علاقے کو بھی مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ شری لنکا کا جزیرہ ہندستان کے جنوبی ساحل سمندر کے قریب واقع ہے اس لیے یہ نام اپنی مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے پرانے ناموں میں سے ایک سنہل دیپ ہے۔ سنہل لفظ "سنہ" یا "سنگھ" سے نکلا ہے جس کے معنی شیر ہوتے ہیں۔ اس ملک میں بھی بدھ مذہب کے پیروؤں کی تعداد کافی ہے اس لیے شیر کو جو خصوصی ترجیح دی گئی اس کا ہم نے سنگاپور کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ فارس اور عرب کے جہاز رانوں اور تاجروں نے سنہل دیپ کو سراندیپ کی شکل میں اپنایا۔ پالی میں سنہل "سہالن" بن گیا" جو "سیلن" کے روپ میں مختصر ہوا۔ تیرھویں صدی میں قزوینی نے اس ملک کے لیے سیلن کا نام استعمال کیا ہے۔

جسے بعد میں یورپی جہاز رانوں اور تاجروں نے "سیلون" کی شکل دی ہے۔ تمل زبان میں تلفظ کی خصوصی تبدیلیوں کے بعد "سیلن" نے "ایلم" کی شکل اختیار کرلی۔

مالدیپ "مالا" یعنی ہار اور "دیپ" یعنی جزیرہ سے مل کر بنا ہے۔ کیونکہ یہ جزیرے ایک ہار کی طرح سمندر کے اندر بچھے ہوئے ہیں اس لیے انھیں مجموعی طور پر مالدیپ کہا گیا۔ یہ علاقہ نسلی اور تہذیبی اعتبار سے ہندستانی صوبے کیرالا سے قربت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے لفظ "مال" کا "ملیالم" اور "مالابار" میں شامل "مال" کے جزو سے بھی تعلق محسوس ہوتا ہے۔ "ملائی" دراوڑ زبانوں میں "پہاڑ" کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مالدیپ میں پہاڑی حصہ نہیں ہے اور سطح سمندر سے زیادہ سے زیادہ تمیں میٹر کی اونچائی ہے چنانچہ دنیا میں موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے عام درجۂ حرارت کے بڑھنے اور قطب کے علاقے کی برف پگھلنے کی سبب سطح سمندر کے اوپر اٹھنے سے سب سے زیادہ مالدیپ کے لوگوں کو فکر لاحق ہے۔ خود مالدیپ کے باشندے نے اپنے ملک کو "دویہی" کہتے ہیں جو کہ لفظ "دویپ" (جزیرے) کی ہی ایک شکل ہے۔

عراق دنیا کا سب سے پُرانا اور سب سے زیادہ مصروف میدان جنگ رہا ہے۔ یہاں دنیا کی بڑی خونریز لڑائیاں لڑی گئی ہیں۔ قدیم ترین جنگ جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے وہ ۵۴۹ قبل مسیح میں لڑی گئی تھی جب دارائے اعظم نے اس علاقے کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا تھا۔ ۳۳۱ء قبل مسیح میں سکندر اعظم نے اس پر فتح پائی لیکن اس سے پہلے بھی سمیری "عکادی" بابلیوں اور اسیریوں کی حکومتوں کو کچھ کم تباہیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ ان جنگوں کا ایک بڑا سبب اس علاقہ کا محل وقوع اور اس کی ہموار میدانی سطح بھی ہے۔ خود اس کا نام عراق اس کا یاد دلاتا ہے۔ عراق کا مطلب وہ شاداب چراگاہ ہے جو ساحل پر واقع ہو۔ اسی وجہ سے پہلے موجودہ عراق کو "عراق عرب" کہا جاتا تھا یعنی دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے کنارے آباد عرب علاقہ۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران اس علاقے کا میسوپوٹے میا کے نام سے ذکر کیا جاتا تھا جو کہ یونانی زبان کا ایک لفظ ہے اور اس کے معنی "دریاوں کے درمیان" کے ہوتے ہیں۔ قدیم عرب جغرافیہ نویس عراق عجم کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس سے خراسان اور اصفہان کا وہ علاقہ مراد لیا جاتا ہے جو دریائے جیحون کے کنارے پڑتا ہے۔

عرب کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی بتاتے ہیں کے یہ لفظ "اعراب"

سے مشتق ہے جس کے معنی زبان آوری اور اظہار مافی الضمیر کے ہیں۔ چونکہ عرب اپنے آپ کو فصاحت میں بے مثال سمجھتے تھے انھوں نے اپنے لیے یہ نام اختیار کیا جب کہ وہ دوسروں کو عجم یعنی بے زبان کے نام سے پکارتے تھے۔ عرب کا پہلا نام عربہ تھا۔ سامی زبانوں میں عربہ 'صحرا اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے۔ عبرانی میں ''عربا'' بیابان اور میدان کو کہتے ہیں۔ کیونکہ عرب کا ملک زیادہ تر ایک بیابان بے آب و گیاہ ہے اس لیے اس کا نام ''عربہ'' قرار پایا۔ لفظ عرب سب سے پہلے ایک ہزار قبل مسیح میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں سننے میں آتا ہے۔

جارڈن عبرانی لفظ یُردن کی انگریزی شکل ہے۔ اس کے معنی اوپر سے اترنے والا ہوتے ہیں ہیں۔ جارڈن دراصل ایک دریا ہے جو فلسطین کے وسیع میدان سے گذرتا ہوا بحیرۂ مردار میں گرتا ہے۔ اس وقت اس کے ایک طرف ملک اُردن ہے جسے لندن میں ۲۲/ مارچ ۱۹۴۶ء کو ہوئے ایک معاہدے کے ذریعے ٹرانس جارڈن '(جارڈن کے پار) کے نام سے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔

لبنان کے لفظی معنی ''سفید'' کے ہیں۔ اس سفید رنگ کا تعلق یہاں کے پہاڑوں کے سلسلے سے ہے جو دو وجہوں سے ہو سکتا ہے یا تو اس برف کی وجہ سے جو سال کے زیادہ حصے میں اس پہاڑ کی چوٹی کو ڈھکے رہتا ہے یا پھر یہاں پائی جانے والی چونے کے پتھر کی سفید پہاڑیوں کی وجہ سے ہے۔

فلسطین کے وقت کے ساتھ ساتھ کئی نام تبدیل ہوئے ہیں۔ دریائے اردن اور بحیرۂ مردار کے مغرب میں واقع علاقے کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل سرزمین کنعان کا نام دیا گیا تھا۔ کنعان حضرت نوح کے بیٹے حام کا چوتھا بیٹا تھا اور فنیقیوں کا جدِ اعلیٰ تھا۔ لفظ کنعان کا مفہوم عبرانی زبان میں ''نشیب اور ہموار'' کا ہوتا ہے۔ یہ سرزمین بھی جو کہ ساحل سمندر تک پھیلی ہوئی تھی نشیبی اور ہموار تھی اور یہاں قریبی علاقوں سے برّی اور بحری راستوں سے لوگ آتے اور بستے رہتے تھے۔ اس بنا پر عبرانی زبان میں اس ساحلی پٹی کا نام فلیشث (Pelesheth) یعنی اجنبیوں کا ملک پڑ گیا۔ لفظ فلسطین کی اصل یہی عبرانی نام ہے۔ رومن لوگوں نے اس پر ۶۳ قبل مسیح میں قبضہ کر لیا اور اس کو فلسطینی سوریہ (Syria Palestina) کا نام دیا۔ مسیحیت کے فروغ کے ساتھ ساتھ فلسطین سے وہ سارا علاقہ مراد

لیا جانے لگا جن میں مسیحیوں کے مقدمات مقدسہ آتے تھے۔ جب پہلی عالمی جنگ کے بعد یہودیوں کو بسانے کی پالیسی طے کر لی گئی تو فلسطین کے نام کو پھر سے زندہ کیا گیا اور فلسطین کے لفظی معنی نے ایک بار پھر اپنا اثر دکھایا جب نئے اجنبی اس خطے کے مالک بن گئے۔

بحیرۂ روم کا جزیرہ سائپرس جسے عربی میں قبرص کہا جاتا ہے، قدیم یونانی تہذیب کے فروغ کے زمانے میں ایک اہم مرکز تھا، کہا جاتا ہے کہ یہ حسن کی دیوی وینس (Ve-nus) کے مندر کی وجہ سے خاص طور پر مرجع خلائق تھا۔ وینس کے ناموں میں سے ایک سپریا (Cypria) بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کا نام سائپرس پڑا۔ سائپرس میں تانبے کی کانیں زمانۂ قدیم میں دریافت ہو چکی تھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تانبے کے لیے لاطینی لفظ سپریم (Cyprium) سائپرس میں اس کی کانیں ہونے کی وجہ سے بنایا تانبے کا لفظ اصل تھا اور اس جزیرے کو "تانبے کی سرزمین" بتانے کی وجہ سے اسے سائپرس کہا گیا۔

یہیں لفظ "یونان" کی حقیقت پر غور کر لینا مناسب ہوگا۔ جس ملک کو انگریزی میں گریس (Greece) کہا جاتا ہے اس کو اردو میں یونان کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ "آیونیا" کا وہ علاقہ جس سے اردو کا ترجمہ "یونان" لیا گیا ہے وہ ایشیائی ترکی میں واقع ہے اور اس کے مغربی ساحل پر سمرنا سے مائی لے ٹس تک پھیلا ہوا ہے۔ ۱۱۰۰ قبل مسیح کے قریب ڈورِس کے لوگوں کے حملے سے بچنے کے لیے مشرقی گریس کے بہت سے لوگ آیونیا میں آکر بس گئے۔ انھوں نے یہاں یونانی علم و فن کی روایت کو ترقی میں دینے میں زبردست حصہ لیا۔ یہیں فیثاغورث (پائے تھاگورس)، ہیراقلیطس وغیرہ جیسے اعلا پائے کے حکیم ہوئے۔ گریس کے باشندے خود اپنے ملک کو "ہیلس" (Hellas) کہتے ہیں۔ یہ نام "ہے لین" (Hellenes) نامی ایک قبیلے پر مبنی ہے جس کا جدِ اعلا ہے لین تھا۔ یہ قبیلہ منتقل ہو کر تھیسلی کے ایک حصے میں آباد ہوا تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں اس نسل کے کچھ خاندان اٹلی کے علاقے کیومے (Cumae) میں آکر بس گئے۔ کیونکہ یہ لوگ مغربی گریس کے ایک علاقے گراٹیا سے آئے تھے اس لیے رومن لوگوں نے انھیں "گرا ای" (Graii) کا نام دیا اور ان کے وطن کو گریسیا (Graecia)۔ اسی نے گریس کی شکل اختیار کی۔ سکندر کی فوجوں کے ساتھ یونانی ہندستان تک پہنچے اور ہندستانیوں نے ان کے لیے "یون" کا نام استعمال کیا بعد میں "یون" کسی بدیسی ملیچھ کے لیے بولا جانے لگا۔ کچھ ایسی

ہی نسلی نفرت کا اظہار کرنے کے لیے بعد میں "فرنگی" کا لفظ استعمال کیا گیا۔

لفظ فرنگی دراصل فرینک نسل کے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ فرینک جرمن قوم کے قبائل میں سے تھے جو ۲۵۶ عیسوی کے قریب جنوب میں دریائے رہائن کے وادی میں منتقل ہوئے۔ پانچویں صدی میں ان میں سے ایک قبیلے کے سردار نے جس کا نام کلوویس تھا عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ چرچ نے اس کی مدد کی کہ وہ دوسرے قبیلوں کو مغلوب کرے اور انھیں عیسائی بنائے۔ اس طرح اس فرینک سردار نے جس علاقے پر اپنی حکومت قائم کی اس کا نام فرانس پڑا۔ بتایا جاتا ہے کہ فرینک لاطینی لفظ Francus اور بائی جرمن کے Franco سے نکلا ہے جس کے اصل معنی ایک قسم کا بھالا ہوتے ہیں۔ اس قسم کے ہتھیار کو چلانے میں خاص مہارت رکھنے کی وجہ سے اس ذات کا نام فرینک پڑا۔ گیارھویں صدی میں جب مسیحی مقدس مقامات پر قبضہ کرنے کا جنون یوروپ میں پھیلا تو فرانسیسیوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کا مقابلہ کرنے والے مسلمانوں نے صلیبی جنگوں میں سب ہی شرکت کرنے والوں کو فرانس کا باشندہ تصور کرتے ہوئے اصحاب فرنج کا نام دیا جس نے فارسی میں "فرنگی" کی شکل اختیار کی۔ ہندستان میں فرنگی کا لفظ پہلے پرتگالی لٹیروں کے لیے استعمال ہوا۔ بعد میں جب انگریزوں نے اس ملک میں اپنے قدم جمائے تو انگریزوں کو حقارت سے فرنگی کہا جانے لگا۔ کیونکہ یوروپ کے لوگ عیسائی تھے اس لیے بعض اوقات فرنگی سے مسیحی لوگ بھی مراد لیے جانے لگے۔ فرانس کے علاقے کو رومن لوگ گال (Gallus) کے نام سے پکارتے تھے جو مرغی کے لیے لاطینی لفظ Gallus سے نکلا تھا۔ بعد میں مرغ کو فرانس کے قومی نشان کی حیثیت سے اختیار کیا گیا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فرانس کے ترنگے جھنڈے میں لال پٹی مرغ کی کلغی۔ سفید پٹی اس کے پروں اور نیلی پٹی اسکے پروں اور پنجوں کو ظاہر کرتی ہے۔

جرمن لوگ اپنے ملک کا نام جرمنی نہیں بلکہ ڈوائش لانڈ بتاتے ہیں۔۔ ڈوائش کا تعلق ایک ایسے لفظ سے ہے جس کے معنی محض "لوگ، عوام" ہیں اور ڈوائش لانڈ کا مطلب "لوگوں کا وطن"۔ جرمنی کو رومن لوگوں نے جرمانیا کا نام دیا۔ لیکن انھوں نے یہ نام انگلستان یا فرانس سے اخذ کیا تھا اور اس کی اصل شاید ایک کیلٹک لفظ "جیر" تھا جس کا مطلب پڑوسی ہوتا ہے۔

انگلستان میں ایک کہانی رائج تھی کہ وہاں کے شہر یارک کو ایب رانکس نامی ایک سردار نے بسایا تھا۔ اس کے بیس بیٹے اور تیس بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے سب سے بڑا بیٹا تو انگلستان میں رہا اور باقی انیس بیٹوں نے جاکر جرمنی بسایا اور اسی مناسبت سے یہ ملک جرمنوں یعنی بھائیوں کا ملک کہلایا۔ فرانس کے لوگ جرمن کو المان کہتے تھے جو دراصل اس علاقے میں رہنے والے قبیلوں کا نام تھا۔ اسی بنیاد پر عربی میں جرمنی کو المانیہ کہا جاتا ہے۔

جرمنی کے مشرق کے میں آسٹریا کا ملک ہے جس کا جرمن نام ایوسٹر رائش Os-terreich ہے یعنی "مشرقی حکومت"۔ یہ علاقہ رومن ہولی ایمپائر کی مشرقی سرحد پر واقع تھا جس کو Ostmark کہا جاتا تھا۔

پولینڈ والے اپنے ملک کا نام پولسکا بتاتے ہیں جس کا مطلب "کھیت" یا "میدان" ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے یہ نام ایک پرانے قبیلے "پولانل" کے نام پر ہے۔ "پولانل" کے لفظی معنی "کھلے دیہات میں رہنے والے" ہوتے ہیں۔

انگلینڈ کے نام کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس کے لیے ہمیں تاریخ میں ۴۰۹ء تک پیچھے جانا پڑتا ہے جب رومن اس جزیرے کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کے بعد شمالی یوروپ کے کئی قبیلے اس پر چڑھ دوڑے۔ ان میں سیکسن اور جوٹ قبیلوں کے علاوہ اینگل لوگ (Angles) بھی تھے۔ ان ہی اینگل لوگوں کے نام پر انگلینڈ کا نام پڑا۔ ہندستان میں انگلستان کے لوگوں کے لیے انگریز اور وہاں کی زبان کے لیے انگریزی کے الفاظ مستعمل ہیں۔ انگریز اور انگریزی کے الفاظ ہم نے پرتگالیوں کے توسط سے تیار کئے ہیں جو انگلستانی باشندوں کے لیے انگ لیز کا لفظ بولتے ہیں۔

وہ جزیرہ جس میں انگلستان واقع ہے اسکے لیے پہلے یونانیوں نے برطانیہ (بریٹن) کا نام تجویز کیا تھا جسے بعد میں رومن لوگوں نے اپنا کر عام کیا۔ اس جزیرے کے تین حصے ہیں انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور ویلز۔ ایک عرصے تک انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں الگ الگ حکمراں حکومت کرتے رہے۔ لیکن جب ملکہ ایلزبتھ اول کے بعد اسکاٹ لینڈ کے جیمس ششم نے انگلستان کے جیمس اول کے طور پر باگ ڈور سنبھالی تو اسکے گریٹ بریٹن (برطانیہ عظمیٰ) کا تاجدار کہا گیا۔ لیکن دونوں ملکوں کی پارلیمینٹ ۱۷۰۷ء میں ملکہ این کے زمانے میں متحد ہوئی تب سرکاری طور گریٹ بریٹن کو سرکاری قبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۸۰۱ء میں جب

آئرلینڈ کو بھی اس یونین میں شامل کر لیا گیا تو ملک کا نام یونائیٹڈ کنگ ڈم ہو گیا۔

برطانیہ کو روایتی طور پر ایک ایسی نسوانی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جو ایک گلوب پر بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا ہاتھ ایک ڈھال پر ہوتا ہے اور دوسرے میں ایک بھالا۔ یہ شکل سب سے پہلے دوسری صدی عیسوی میں ایک رومن سکے پر بنائی گئی تھی۔ انگلستان میں یہ شکل سب سے پہلے ۱۶۶۵ء میں چارلس دوم کے عہد میں تانبے کے سکے پر ڈھالی گئی۔

نئی دنیا میں قدم قدم پر غلط فہمیوں کی کہانیاں ملتی ہیں۔ کنیڈا کے نام کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ فرانسی جہاز راں یاک کاغشے (Jacques Cartier) نے سینٹ لارنس دریا کی کھوج کے بعد جب موجودہ شہر کیوبک کے پاس پڑاؤ ڈالا تو اس نے ایک ریڈ انڈین قبیلے کے سردار سے اس علاقے کا نام پوچھنا چاہا۔ سردار نے "کناٹا" کہا اور بار بار اپنے ہاتھ پھیلا کر گھمائے۔ کاغشے نے سمجھا کہ کناٹا اس پورے علاقے کا نام ہے حالانکہ سردار کی ریڈ انڈین بولی میں اس کا مطلب صرف گاؤں یا بستی تھا۔ شروع میں فرانسیسی قبضے کے تحت اس ساری زمین کو نیو فرانس کا نام دیا گیا۔ جب انگریزوں نے اس علاقے کو چھین لیا تو انھوں نے اسے پہلے کیوبک کے نام سے پکارا۔ لیکن ۱۷۹۱ء کے بعد اسے کینڈا کہا جانے لگا۔

میکسکو کے نام کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میکسکو جسے وہاں کے لوگ "میی کو" کہتے ہیں ' اس علاقے میں رائج قدیم ازٹیک دیومالا کے لڑائی کے دیوتا "میی تلی" کے نام پر ہے۔ دوسرے یہ کہ میکسکو شہر کا اصل نام "میتز ہی کو" تھا جس کا مطلب "چاند کی جھیل کی ناف" تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ میکسکو شہر ایک جھیل کے اندر واقع ٹاپو پر آباد تھا۔

وسطی امریکہ میں واقع ملک گواٹے مالا کا نام ایک ازٹیک لفظ پر مبنی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے "درختوں کا دیس" لیکن ایک دوسرا ماخذ بھی بتایا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے "پانی کی کلیاں کرنے والا پہاڑ" جس سے کوہ آتش فشاں کی آتش فشانی کی جانب اشارہ ہے۔

پڑوسی ملک ہانڈورس کا نام "ریوہانڈو" سے ماخوذ ہے جس کا اسپینی میں مطلب گہرا

دریا ہوتا ہے اور یہ اس دریا کا نام ہے جو برٹش ہانڈورس (جس کا موجود نام "بے لیز" ہے) اور جزیرہ نما یکاتن کے درمیان حد بناتا ہے۔

کوسٹاری کا نام کے لفظی معنی دولت سے بھرپور ساحل ہیں ۱۵۰۲ء میں کولمبس نے اپنے چوتھے سفر کے دوران وسطی امریکہ کے اس ساحلی علاقے کو دریافت کیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ کولمبس نے دیکھا کہ وہاں کا ہر باشندہ ٹھوس سونے کا زیور پہنے ہوئے ہے اور دوسری روایت کے مطابق ان باشندوں نے کولمبس کو جو تحائف پیش کئے ان میں کئی چیزیں سونے کی تھیں۔ اسے دیکھ کر کولمبس نے یہ اندازہ لگایا کہ یہاں دولت کی فراوانی ہے اور اس نے اس کا نام کوسٹاریکا یا دولت سے بھرا ساحل رکھ دیا۔

جنوبی امریکہ کے ملک وے نے زوئیلا کے لفظی معنی "چھوٹا وینس" ہیں۔ اٹلی کا شہر وینس اپنی آبی گزرگاہوں کی وجہ سے مشہور ہے جن پر آمدورفت کشتیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ جب یوروپی جہازراں اور ملاح جنوبی امریکا کے اس علاقے میں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کے یہاں کے لوگ جھیل مارا کوئی بو میں کھمبے گاڑ کر ان کے اوپر مکان بنا کر رہتے ہیں اور جھیل کے پانی میں ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ اس سے انھیں وینس کی یاد آئی اور انھوں اس جگہ کا نام چھوٹا وینس رکھ دیا جو بعد میں پورے ملک کا نام ہوا۔

کولمبیا کا نام تو کولمبس کے نام پر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کولمبس نے کبھی اس ملک میں قدم نہیں رکھا۔ اس کے دوسرے سفر کے دوران اسکے دوسرے ساتھی الانسو دا اوپے دا نے اسے سب سے پہلے ۱۴۹۹ء میں دیکھا۔ ان اسپینیوں نے شہر غرناطہ کے نام پر اس کا نام نیوگرے نے ڈا رکھا تھا جو بعد میں کولمبس کے اعزاز میں کولمبیا کر دیا گیا۔ اس علاقے کے باشندے نے ان غیر ملکیوں کو جو کہانیاں سنائیں ان میں ایک دریائے امیز ان کے کنارے راج کرنے والے ایک راجا کی کہانی بھی تھی۔ یہ بتایا گیا کہ یہ راجا بے حساب دولت کا مالک تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے جسم پر تیل چپڑ کر اس پر سونے کا بُرادہ چپکایا کرتا تھا۔ اس لیے اسپین والوں نے اس راجا کا نام "ایل ذوراڈو" رکھ دیا جس کے اسپینی زبان میں "سونا چڑھا ہوا" کے معنی ہوتے ہیں۔ اس سے بے پناہ دولت کے قصوں نے لوگوں کو پاگل کر دیا اور اسپین اور انگلستان سے کئی ٹولیاں اس علاقے کی تلاش میں جس کا نام ہی اب ایل ڈوراڈو پڑ گیا تھا نکل پڑیں اور ناکامی کا منہ دیکھا۔

جنوبی امریکا کا سب سے بڑا ملک برازیل بھی مغرب کے راستے ہندستان کی تلاش کی کوشش کے نتیجے میں دریافت ہوا۔ ۱۵۰۰ء میں پرتگالی جہازراں پیدور الوارس کبرال ہندستان آنا چاہتا تھا اور جنوبی امریکہ کے ساحل سے جا لگا۔ اس نے اس علاقے کا نام ویرا کروز (Vera cruz) یعنی اصلی کراس رکھا۔ اس علاقے کے گھنے جنگلوں میں اسے وہ درخت کثرت سے ملے جن کی لکڑی سے نایاب سرخ رنگ نکالا جاتا تھا کیونکہ یہ رنگ سرخ انگارے کی طرح ہوتا تھا اور انگارے کو پرتگالی زبان میں براز (Brasa) کہتے تھے۔ اس لکڑی کو برازیل کہا جاتا تھا۔ چنانچہ کبرال یہ لکڑی اپنے جہازوں میں بھر کر پرتگال لوٹ گیا اور جلد یہ علاقہ Terra de brasil یعنی برازیل کی زمین کہلانے لگا جو مختصر ہو کر صرف برازیل رہ گیا۔

بولے ویا کی دریافت کے بعد وہ اسپینی حکومت کے تحت آگیا اور اسے بالائی پیرو کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ۱۶۶۱ء میں اسپین سے آزادی کے لیے جدوجہد شروع ہوئی اور ۱۸۲۵ء میں مشہور انقلابی اور جنرل سیماں بولی وار (Simon Bolirar) نے اس ملک کو آزاد کرا لیا۔ پہلے اس کا نام شارکس (Charcas) رکھا گیا اور پھر بولی وار کے اعزاز میں بولیویا کہلایا۔

ارجنٹائن کا نام بھی دولت کے دیوانے یوروپ کے مہم کاروں نے رکھا تھا۔ انھیں بتایا گیا تھا کہ اس ملک میں چاندی کی بڑی بڑی کانیں ہیں چنانچہ سولھویں صدی میں اسپین کے لوگوں نے اس پر چڑھائی کر دی اور اس ملک کو ہی "چاندی کا دیس" کہنے لگے۔ ارجنٹائن ایک یونانی لفظ سے نکلا ہے جسکے معنی "چاندی" ہوتے ہیں۔

چلی کا نام بہر حال وہاں کے مقامی لوگوں کی زبان کا ہے اور اس کا مطلب ہے وہ جگہ جہاں زمین ختم ہوتی ہے۔ چلی جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ایک لمبی پٹی کی شکل میں ہے اور اس کے آگے مغرب میں بحر الکاہل کا وہ بسیط و عریض سمندر ہے جس کو اس زمانے میں ناقابل عبور سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کے لیے یہ زمین کا آخری سرا تھا۔

بحر کے رے بین میں واقع جزیرے جمیکا کو کولمبس نے ۱۴۹۴ء میں دریافت کیا اور اس کا نام سینٹیاگو رکھا تھا لیکن یہاں کے مقامی باشندوں نے جزیرے کا جو نام رکھا تھا وہ برقرار

رہا۔ ان انڈین لوگوں کی بولی میں جمیکا کا مفہوم "خوب پانی والا" ہوتا تھا اور کیونکہ یہاں کثرت سے بارش ہوتی ہے جس کا اوسط ۷ انچ سالانہ ہے اور سو سے زیادہ ندیاں اور چشمے ہیں اسلیے یہ نام اس علاقے کے لیے بالکل موزوں ہے۔

بار بے ڈاس جزیرے کے لفظی معنی ہیں داڑھی والا۔ یہ مانا جاتا ہے کہ جب اسپین کے کھوج کرنے والے اس جزیرے کے پاس پہنچے تو انھیں ساحل پر کثرت سے لمبی جٹاؤں والے انجیر کے درخت دکھائی دیئے جس سے انھوں نے یہ عجیب و غریب نام رکھا۔

افریقہ کے ممالک کے ناموں کے سلسلے میں ایک دلچسپ روایت داہومی کے بارے ہے جسے اب "بے نن" کہا جاتا ہے۔ ۱۶۲۵ء میں یہاں ابومی نام کی ایک بادشاہت تھی جسکا ایک طاقتور بادشاہ ویگ باجا تھا۔ ابومی کے باشندوں کی پڑوسی قبیلوں سے رقابت چلتی رہتی تھی جو اکثر لڑائی کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ پڑوسی راجاؤں میں سے ایک کا نام دآ تھا۔ ویگ باجا اس پر بھاری پڑا اور اس نے دآ کو قتل کر دیا۔ اس وقت ویگ باجا کے محل کی تعمیر چل رہی تھی۔ ویگ باجا نے دآ کی لاش کو محل کے لیے کھودی جاری بنیاد میں دفن کر کے اس پر اپنے محل کی دیوار کھڑی کر دی۔ جب یہ محل بن کر تیار ہوا تو اس کا نام دآہومی رکھا گیا۔ اس کے معنی تھے وہ جو دآ کے پیٹ پر کھڑا ہے اور اسی نام سے ویگ باجا نے فخریہ اپنے ملک کو پکارا۔ ۱۸۹۲ء میں اس علاقے پر فرانس کا قبضہ ہوا اور ۱۹۶۰ء میں اسے پوری آزادی ملی۔ ۱۹۷۵ء میں جا کر داہومی کا نام بدلا گیا اور اب وہ قرون وسطیٰ کی ایک بادشاہت کے نام پر بینن کہلاتا ہے۔ یہاں کے خاص دریا کا نام بھی بینن ہے۔

بینن کے پڑوس میں بر کی نا فاسو نامی ملک ہے۔ یہ پہلے اپر وولٹا یا بالائی وولٹا کے نام سے ایک فرانسیسی عملداری تھی۔ وولٹا مغربی افریقہ کے بڑے دریاؤں میں ایک ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اسے آزادی ملی۔ ۱۹۸۳ء تک یہاں چار بار فوج نے تختہ پلٹ کر سرکار چلائی۔ اس کی وجہ عوامی سرکاروں میں بڑھتی ہوئی بد عنوانی بتائی گئی۔ چنانچہ ۱۹۸۴ء میں اس کا نام بدل بُر کی نا فاسو رکھا گیا جس کا مطلب "ایماندار لوگوں کا ملک" ہوتے ہیں۔ اس وقت کیپٹن ٹامس سنکرا نے ملک کا نام بدلنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی اعلان کیا تھا کہ سارے حکام کے جن میں خود صدر بھی شامل تھا، بینک کھاتے لوگوں کی جانچ کے لیے کھلے رہیں گے لیکن اس کے بعد بھی اس ملک میں ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۹ء میں حکومتوں کو زبردستی

اکھاڑ پھینکا گیا ہے۔ شاید نام کا اثر ہونا ابھی باقی ہے۔

مغربی افریقہ کے ملک سیرالیون کو ۱۴۶۲ء میں پرتگالی جہاز راں پیدرو داسنترا نے دریافت کیا اور یہ نام رکھا۔ سیرالیون کے معنی پرتگالی میں "شیروں والا پہاڑ" ہوتے ہیں۔ اس وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پیدرو نے جس جگہ اپنے جہازوں کو لنگر انداز کیا وہ ایک قدرتی بندرگاہ بنائے جانے کے لیے نہایت موزوں جگہ تھی اور اسے پہاڑیاں اس طرح گھیرے ہوئے تھیں جیسے کوئی شیر گھات لگائے ہوئے بیٹھا ہو لیکن یہ شیر ان انگریزوں کو ڈرا کر نہیں بھگا سکا جو ۱۵۶۲ء میں وہاں غلاموں کی تلاش میں پہنچے اور تقریباً دو صدی تک انھوں نے اس بندرگاہ سے غلاموں کی تجارت کی۔ ۱۵۵۷ء میں جب انگلستان میں غلاموں کی آزادی کی تحریک نے زور پکڑا تو بعض انگریز مخیّر لوگوں نے اس بندرگاہ کے قریب کی جگہ خریدی اور فری ٹاؤن کے نام سے بنائی گئی اس بستی میں آزاد کیے ہوئے غلاموں کو بسایا گیا۔ لفظ "سیرا" کے لاطینی میں معنی لکڑی چیرنے والے آرے کے ہوتے ہیں اور اس سے عام طور پر پہاڑوں کے ایسے سلسلے کو مراد لیا جاتا ہے جن کی ایک کے بعد ایک چوٹیاں دور سے دیکھنے پر آرے کے دندانوں کی طرح لگتی ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا سے آزاد کیے ہوئے غلاموں کے لیے لائبیریا وجود میں آیا جو کہ افریقہ کے سب سے پرانی ری پبلک ہے۔ لائبیریا کا نام لبرٹی یعنی آزادی سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں امریکن کالونائزیشن سوسائٹی کے نام سے ایک جماعت بنائی گئی تھی جس نے امریکہ میں آزاد کئے ہوئے غلاموں کے لیے مغربی افریقہ میں ۱۸۲۲ء میں ایک بستی بسائی۔ ۱۸۴۷ء میں لائبیریا کی آزاد ری پبلک کا قیام عمل میں آیا۔

وہ ملک جو اب گھانا کہلاتا ہے اسے پہلے گولڈ کوسٹ (سونے کا ساحل) کہا جاتا تھا اور مغربی افریقہ میں جس علاقے کو یوروپ کے لوگوں نے سب سے پہلے اپنی تجارت پھیلانے کے لیے جس مقام کو چنا وہ یہی تھا۔ یہاں سے انھیں سونا لے جانے میں خاص دلچسپی تھی۔ یوروپ والوں کو کپڑا، دھاتوں کا سامان، رنگ برنگے منکے اور موتی اور ہتھیاروں کے بدلے ساحل پر ہی سونا مل جاتا تھا۔ شروع میں یوروپ کے لوگ اندرون ملک جانے سے ڈرتے تھے کیونکہ افریقہ کے جنگلی قبائل میں آدم خوری کی روایتوں نے انھیں خاص طور پر خوفزدہ کر رکھا تھا۔ ۱۹۵۷ء تک یہ ملک گولڈ کوسٹ کہلایا۔ اس کے

بعد خود مختاری حاصل ہونے کے ساتھ ملک کا مقامی نام گھانا کی شکل میں منتخب کیا گیا۔ دراصل گھانا وسط افریقہ کی ایک قدیم بادشاہت کا نام تھا جس کی چوتھی صدی سے تیرھویں صدی تک حکومت رہی۔ لفظ "گھانا" بنیادی طور پر شہنشاہ کے مثل ایک خطاب ہوتا تھا جو ایک ایسے طاقتور حکمرانوں کے لیے مخصوص تھا جو کمزور قبیلوں سے خراج وصول کیا کرتا تھا۔

گنی کے ساتھ بھی یوروپ کا واسطہ زیادہ تر سونے کی وجہ سے تھا اور وہاں سے جو سونا بر آمد کیا جاتا تھا وہ بڑی اچھی کوالٹی کا سمجھا جاتا تھا اور اس سے جو سکہ ڈھالا جاتا تھا اس کی قیمت ایک پونڈ سے زیادہ ہوتی تھی۔ گنی کے نام کا سکہ ۱۶۶۳ء سے ۱۸۱۷ء تک رائج رہا اور اس کی سرکاری قیمت ۲۱ شلنگ ہوتی تھی جب کہ پونڈ میں ۲۰ شلنگ ہوتے ہیں۔

خود لفظ گنی ایک بربر لفظ سے نکلا ہے جس کا مطلب کالا آدمی ہوتا ہے۔ یوروپ میں کافی عرصے تک اس نام کو براعظم افریقہ کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ اور بعض ایسی چیزوں کو جنھیں افریقی اصل کا تصور کیا گیا انھیں گنی سے وابستہ کیا گیا جیسے گنی پِگ (Guin-ea pig) یا گنی ورم (Guinea worm)۔ یہاں تک کہ جنوب مشرقی ایشیا میں جب (گرین لینڈ کے بعد) دنیا کے دوسرے بڑے جزیرے کو یوروپ والوں نے دریافت کیا تو وہاں افریقہ جیسی آب و ہوا، گھنے جنگلوں اور قبائلی زندگی کے آثار کو دیکھتے ہوئے اس کا نام بھی نیو گنی (یعنی نئی گنی) رکھا گیا۔ اس وقت گنی نام کی ریاست وہ ہے جو پہلے فرانسیسی گنی کہلاتی تھی۔ پرتگالی گنی کو گنی بساؤ کہتے ہیں کیونکہ اس ملک کی راجدھانی بساؤ ہے۔

گے باں (Gabon) کو ۱۴۷۰ء کے بعد پرتگالیوں نے دریافت کیا تھا اور انھوں نے اسے گباؤں کا نام دیا جس کے معنی ٹوپی بجوے چغے کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے جہاں ساحل سمندر پر ایک دریا کے دہانے پر اپنے جہاز کھڑے کئے تھے وہاں گھنے درخت اس طرح جھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے جیسے کوئی پادری کوئی اپنا چغہ پہن کر اوپر سے جھانک رہا ہو۔

زم باب وے نے ۱۹۸۰ء میں آزادی حاصل کی۔ اس سے پہلے اس کا نام جنوبی رہوڈیشیا تھا۔ رہوڈیشیا کا نام سی سل جان رہوڈس کے نام پر رکھا گیا جس نے برطانوی جنوبی افریقہ سے بڑھ کر برطانوی سلطنت کو توسیع دینے کے سلسلے میں اہم خدمات انجام

دی تھیں۔ زم باب وے کے معنی بنٹو زبان میں پتھر کے گھر کے ہوتے ہیں لیکن اکثر اس لفظ کو سرداروں کی قبروں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نام کی جگہیں جا بجا پائی جاتی ہیں اور جب خشک سالی ہوتی ہے یا دوسری آفات آتی ہیں تو اس جگہ یہاں کے مختلف قبیلوں کے نمائندے اپنے اجداد کی روحوں سے دعا کرنے کے لیے اکٹھا ہوتے ہیں۔
۱۸۶۸ء میں ایڈم رینڈرس نامی ایک شکاری نے رہوڈیشیا میں فورٹ وکٹوریا سے تقریباً ۱۷ میل دوری پر پتھر سے بنی دیواروں کے آثار کو دریافت کیا تھا ان دیواروں کے گھیرے جو تقریباً ۴۰ ہیکٹر کے رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں دسویں سے چودھویں صدی کے دوران بنائے گئے تھے لیکن پندرھویں صدی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے باوجود کہ ان آثار کو زم باب وے کھنڈر کہا جاتا ہے ' ملک کا نام صرف ان کی وجہ سے نہیں رکھا گیا ہے۔

شمالی رہوڈیشیا ۱۹۶۴ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد زامبیا کہلایا۔ یہ نام زام بی زی دریا کے نام پر رکھا گیا ہے جو افریقہ کے بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ ٹونگا لوگوں کی بولی میں زام بی زی کا مطلب ہی "بڑا دریا" ہوتا ہے۔۔

۱۹۹۰ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد جنوب مغربی افریقہ کے نام سے جانے جانے والے ملک کے لیے نامی بیا کا نام اختیار کیا گیا۔ اس حصے پر ۱۸۸۴ء میں جرمنی نے قبضہ کر لیا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران اس کو جنوبی افریقہ نے چھین لیا تھا اور ۱۹۹۰ء تک وہ جنوبی افریقہ کے قبضے میں ہی رہا۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں کل رقبے میں اتنے زیادہ ریگستان کا تناسب نہیں۔ اس کے مشرق میں کالاہاری کا ریگستان ہے اور مغرب میں نامیب کا۔ نامیب کے اسی ریگستان کی مناسبت سے اقوام متحدہ نے ۱۹۶۸ء میں اس علاقے کا نام نامی بیا رکھا۔

تنزانیا ایک مرکب نام ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ٹنگانائکا اور ۱۶۶۳ء میں زنجبار آزاد ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں دونوں ملکوں نے متحد ہو کر ایک نئی حکومت کی تشکیل کی اور اس متحدہ ملک کا نام بھی دونوں ملکوں کے ناموں کے ابتدائی حروف (ٹنگانائکا میں سے "تن" اور زنجبار میں سے حرف "ز") لے کر تنزانیا بنایا گیا۔

ایتھوپیا کا نام قدیم یونانیوں کا دیا ہوا ہے اور اس کا مطلب ہے "جس کا منہ جل گیا ہو" اور اس سے کالی نسل کے سب لوگ مراد تھے۔ عربوں نے اسے ابتداءً حبشہ کا نام دیا تھا

اور جلد ہی سیاہ لوگوں کے کے لیے حبشی کا نام عام ہو گیا۔ افریقہ کے باشندوں کے لیے ہندستان میں شدی یا شیدی کا لفظ بھی استعمال کیا گیا۔ دراصل جس زمانے میں دکن کی مسلم ریاستوں میں افریقہ کے باشندوں کو معزز عہدوں پر (خاص طور حفاظتی ذمہ داریوں کے لیے) فائز کیا گیا تو ان کو سیدی کہہ کر پکارا جاتا تھا جو دراصل عربی لفظ سیّدی کی ہی ایک شکل تھی جس کے معنی ہوتے ہیں میرے مالک یا میرے سردار۔ سوڈان کے پڑوس میں واقع اس ملک کو بعد میں ابی سینیا کا نام دیا گیا جو ۱۹۲۳ء میں اس وقت تک رائج رہا جب اسے بدل کر ایتھوپیا کر دیا گیا۔

مصر دنیا کے قدیم تہذیبی مراکز میں سے ایک ہے۔ مصر کے معنی لال کیچڑ بتائے جاتے ہیں۔ غالباً اس سے مراد وہ لال رنگ کی مٹی ہے جو دریائے نیل کے سیلاب کے ساتھ مصری میدانوں میں پھیل جایا کرتی تھی اور اس کی زرخیزی اس علاقے کی خوش حالی کی ذمہ دار تھی۔ یونانیوں اور رومن لوگوں نے اسے وہ نام دیے جو موجودہ یوروپی نام "اجپٹ" (Egypt) کا ماخذ ہیں اور جو مصر کے قبطی نسل کے باشندوں کے حوالے سے وضع کیا گیا ہے۔

ماریشس سے عرب جہازراں دسویں صدی میں واقف ہو چکے تھے۔ یوروپ کے باشندوں میں پرتگالیوں نے اسے ۱۵۰۷ء اور ۱۵۱۲ء کے درمیان دریافت کیا۔ لیکن ۱۵۹۸ء میں ڈچ لوگوں نے یہاں بستیاں بنائیں اور تب ہی انھوں نے یہاں کے گورنر نساؤ کے ماریس (Maurice of Nassau) جسے ڈچ زبان میں Mauritus کہا جاتا تھا کہ نام پر اس کا نام ماریشس رکھا۔ ۱۷۱۰ء میں ڈچ اسے چھوڑ کر چلے گئے اور ۱۷۱۵ء میں اس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا۔ اور اسے جزیرہ فرانس Ile de France کا نام دیا۔ ۱۸۱۰ء میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کیا اور انھوں نے دوبارہ ماریشس کا نام رائج کیا۔

رنگ برنگے الفاظ

قدرت نے خارجی دنیا کو خوبصورت اور رنگین بنانے کے لیے اسے طرح طرح کے رنگوں سے آراستہ کیا ہے۔ لیکن انسان کے لیے یہ رنگ خارجی زندگی میں حسن و مسرت، خوف یاد ہشت کا نظارہ بہم نہیں پہنچاتے بلکہ وہ رنگارنگ تجربوں اور گوناگوں افکار و تاثرات کی علامت بن کر اس کے فکر و خیال کے لیے نئی جہتوں کے امکانات بھی پیدا کرتے ہیں۔ اس کا بھرپور مظاہرہ تقریباً ہر زبان کے اُن اسالیب میں ملتا ہے جو لفظوں، فقروں، محاوروں اور تماثیل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔

سیاہ اور سفید واضح طور پر ایک معنوی تضاد کے حامل ہیں۔ جہاں سیاہی کو بدی بدکاری اور بد قسمتی کے علامت سمجھا جاتا رہا ہے، وہیں سفید کو نیکی اور نیکوکاری اور خوش بختی کی۔ چنانچہ سیاہ باطن، سیاہ دل یا دل کا کالا وہ ہے جو بدی کا سوچتا ہے۔ بدی پر آمادہ رہتا ہے اور جس سے نیکی اور نرم دلی کوسوں دور رہتی ہے۔ اسی لحاظ سے سیاہ کار وہ ہے جو گناہ کا راستہ اختیار کرتا ہے اور بدکاری اور بد کرداری کو اپنا شعار بناتا ہے اور اس کے گناہ یا اخلاق، شرافت اور قانون ضابطوں کے خلاف کام اس کے کالے کرتوت کہلاتے ہیں۔

اسی سے "کالا" کسی چیز کی ایسی شدت کو ظاہر کرتا ہے جو خوف و دہشت کا سبب بنے جیسے کالا کلوٹا شخص جو کاجل کی طرح کالا ہو اور اسے دیکھ کر طبیعت میں اس کی طرف سے ایک طرح کا انحراف پیدا ہو۔ "کالے" کا لفظ اسی لیے سانپ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ نہ صرف کالا سانپ (کوبرا) زہریلا ہوتا ہے بلکہ کنڈلی مارے، پھن پھیلائے زبان لپلپاتے سانپ کو دیکھ کر اندر سے تھر تھری سی پیدا ہوتی ہے۔ اور لوگوں کے اس وہم کے تدارک کے لیے کہ سانپ کا نام لینے سے سانپ نکل آتا ہے اس کو اشارتاً "کالا" کہنا بھی کافی سمجھا جاتا ہے۔ ایک فقرہ ہے "کالا بھجنگ" جو ایسے موٹے تگڑے کالے کلوٹے شخص

کے لیے بولا جاتا ہے جسے دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ "فرہنگ آصفیہ" میں 'بھجنگ' کو بھجنگا نامی پرندے سے نسبت دی گئی ہے۔ جب کہ "بھجنگ" کالے سانپ یا ناگ کو کہتے ہیں۔ ڈراونی بلا کو ایک کالے سایے کی شکل میں تصور کرتے ہوئے اسے "کالی بلا" کہا گیا ہے۔ بہار اور ملحقہ علاقوں میں بعض اوقات "کالا آزار" نام کی مہلک بیماری پھیل جاتی ہے ۔ہندی ڈکشنریاں اسے "کالا جوار" (काला-ज्वर) یعنی میعادی بخار سے ماخوذ سمجھتی ہیں۔۔ لیکن "آزار" کو تکلیف یا تکلیف دہ مرض کے معنی میں مستعمل فارسی لفظ ماننے میں کوئی امر مانع نہیں، امراض کی دہشت انگیزی کے مدنظر ان کے ساتھ "کالے" کا استعمال کیا جانا ایک عام بات ہے۔ اُلجھی ہوئی خشک کھانسی کو یوں تو عام زبان میں "ٹھکر کھانسی" یعنی کتے جیسی کھانسی کہا جاتا ہے لیکن اس مرض کی شدت کے مدنظر اسے "کالی کھانسی" کہا جانے لگا ہے۔ اسی انداز پر چیچک کے خطرناک مرض کو "کالی ستیلا" کا نام دیا گیا ہے۔

جزائر انڈمان کو "کالا پانی" کہنے کے پیچھے بھی اس دہشت وہراس کو محسوس کیا جاسکتا ہے جو مجرموں کو اس وقت کے عام خیال کے مطابق ایسے غیر صحت مند آب وہوا والے جزائر میں جہاں آدم خور قبائلی بستے تھے عمر قید کی سزا بھگتنے کے لیے بھیجے جانے کے خیال سے پیدا ہوتا تھا۔ حالانکہ ہندی ڈکشنریوں "ہندی شبد ساگر" اور "مانک ہندی کوش" میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ خلیج بنگال کے اس حصے کا پانی کالا ہوتا ہے لیکن یہ بات کسی جغرافیائی حقیقت پر مبنی نہیں ہے اور یہ شاید بعد میں کی گئی توجیہہ ہے۔ انگریزی لغت "ہابسن جابسن" میں "کالا پانی" کا ذکر کرتے ہوئے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ہندستان میں سمندر پار کرکے جانے پر سماجی پابندی تھی اور سمندر پار جانے والے کو ذات سے باہر نکالا جاسکتا تھا۔ چنانچہ جن لوگوں کو انڈمان بھیجا جاتا تھا ان کے لیے یہ سزا سماجی اعتبار سے بھی باعث رسوائی تھی اور انڈمان ان کے لیے کالا یعنی منحوس پانی تھا لیکن تاریخی اعتبار سے انڈمان ایسی اکیلی جگہ نہیں تھی جہاں ہندستانیوں کو جلاوطن کیا گیا ہو۔ اٹھارھویں صدی میں انگلینڈ کے جلاوطن جنوب مغربی سماترا میں واقع بنکولین کی بستی بھیجے جاتے تھے اور ہندستانی مجرموں کا پہلا گروہ بھی وہیں ۱۷۸۷ء میں بھیجا گیا تھا۔ ۱۸۲۳ء میں ہندستانی جلاوطن ڈچ بسیت پنانگ بھیجے جانے لگے۔ لیکن دو سال بعد انھیں برطانوی عملداری میں سنگاپور اور ملاکا بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۷۸۹ء میں کیپٹن آرچی بالڈ بلیئر نے (جس کے نام پر پورٹ بلیئر ہے) انڈمان کے ایک چھوٹے سے جزیرے چتھم آئی لینڈ میں جلاوطنوں کی بستی قائم کرنے کی ابتدائی کوشش کی تھی لیکن ۱۷۹۱ء میں اس بستی کو انڈمان کے اس حصے میں منتقل کیا گیا جو اب پورٹ بلیئر کہلاتی ہے لیکن اس وقت اس کا نام پورٹ کارنولس رکھا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے جرم میں بڑی تعداد میں ہندستانیوں کو عمر قید کی سزا دی گئی جو کہ اس وقت کی اصطلاح کے مطابق "بعبور دریائے شور" مقرر کی گئی۔ ۱۸۵۸ء سے ان قیدیوں کو انڈمان بھیجا جانے لگا اور اسی وقت سے کالا پانی کی اصطلاح رواج میں آئی۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ ابتداءً "بعبور دریائے شور" کا لفظی ترجمہ "کھارے پانی کے پار" استعمال میں آیا ہو لیکن بعد میں سزا کی دہشت انگیزی کے سبب "کھارے پانی" نے "کالے پانی" کی شکل اختیار کر لی ہو۔ غالباً اسی قسم کے تاثرات بعض ہندی ماہرین کے اس رجحان کی بنیاد بنے ہیں جس کے تحت وہ انڈمان کی اصل "اندمان" کو مانتے ہیں جس میں اندا اپنے اندر تاریکی، اندھیرا کا مفہوم رکھتا ہے لیکن مغربی محققین اس کی تائید نہیں کرتے۔ انسائکلو پیڈیا برٹینکا ملایا کی زبان کے لفظ "ہندمان" کو انڈمان کی اصل بتاتی ہے اور "ہندومان" کو "ہنومان" کی بدلی ہوئی شکل قرار دیتی ہے۔ "ہابسن جابسن" میں انڈمان کو "آگمان" سے ماخوذ بتایا گیا ہے۔ اس لغت کے مطابق "آگم" ملایا کی زبان میں ان قبائلیوں کا نام تھا اور "الف نون" عربی تثنیہ کا ہے کیونکہ یہ نام سب سے پہلے عربی تحریرات میں ملتا ہے۔

اس طرح جس کام میں شدت ہو یا جو ناقابل عبور یا ناقابل تسخیر ہو اسے بھی "کالے" سے تعبیر کیا جانے لگا جیسے "کالے کوسوں" سے ایک طویل دشوار گزار مسافت کو مراد لیا گیا۔ "کالا پہاڑ" سے اس کام یا شخص کی جانب اشارہ کیا گیا جس کو پورا کرنا یا شکست دینا آسان نہ ہو۔ ہندستانی تاریخ میں ایسے دو لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو "کالا پہاڑ" کے نام سے معروف تھے۔ ایک بہلول لودھی کا ایک بھانجا جو سکندر لودھی سے لڑا تھا اور دوسرا مرشد آباد کے نواب سلیمان کا ایک سپہ سالار جس نے اڑیسہ اور آسام پر چڑھائی کر کے بڑی فتوحات حاصل کیں مگر ۱۵۸۳ء میں اکبر کی فوج سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

قانون کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا لیکن کالا قانون اسے کہا گیا جو زیادتی کرتا ہو، انصاف کی جگہ اسے بے انصافی کا اندیشہ ہو، اور اس سے لوگوں میں ایک دہشت پیدا ہو اور

ممکنہ زیادتیوں کے اندیشے سے لوگوں کو احتجاج پر آمادہ کرے۔ ہندستان میں "کالا قانون" یا بلیک ایکٹ کی اصطلاح کو سب سے پہلے انگریزوں نے ہی میکالے کے ۱۸۳۶ء میں جاری کیے گئے اس قانون کے خلاف استعمال کیا تھا جس کے تحت دیوانی معاملوں میں انگریزوں کو بھی انھیں عدالتوں میں پیش ہونا ضروری قرار دے دیا گیا جس میں ہندستانی جج سماعت کرتے تھے۔ جب کہ اس سے قبل ہر قسم کے معاملات میں انگریزوں کے معاملات صرف انگریز جج ہی سنتے تھے۔ انگریزوں نے ایک ایسے قانون کو جو گوری نسل کے کسی فریق کو دیسی جج کے سامنے پیش ہونے کے لیے مجبور کرے، گوری نسل کی توہین قرار دیتے ہوئے اس قانون کو کالے قانون کا نام دیا تھا۔ ہندستانیوں نے جس قانون کو کالا قانون بتاتے ہوئے پورے شد و مد سے مخالفت کی وہ ۱۹۱۹ء میں انگریز حکومت کا جاری کیا ہوا رولٹ ایکٹ تھا جس کے تحت کسی بھی ہندستانی کو عدالت میں پیش کیے اور مقدمہ چلائے بغیر حراست میں رکھا جا سکتا تھا اور اسی قانون کے تحت ستیہ پال اور سیف الدین کچلو کی گرفتاری کے احتجاج میں کیے گئے امرتسر کے جلیان والا باغ میں ہونے والے جلسے پر جنرل ڈائر نے گولی چلانے کا حکم دے کر قتل عام کروایا تھا۔

کالا رنگ بعض اوقات کسی پراسرار کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے "کالا چور"۔ جب رات کے وقت لنگوٹی باندھے جسم پر تیل چپڑے ایک کالا کلوٹا انسان چراغ کی روشنی میں سایہ کی طرح بچ بچ کر ادھر سے اُدھر قدم رکھتا دکھائی دے تو ظاہر ہے کہ وہ بڑا پراسرار معلوم ہوگا۔ چنانچہ "کالا چور" کی اصطلاح ایک نامعلوم شخص کے لیے استعمال ہونے لگی۔ اسی طرح دال میں کالا کسی پُراسرار گڑبڑ گھوٹالے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آج کل کسی ہوائی جہاز کے حادثے میں تباہ ہونے کے بعد اس کے بلیک باکس کی تلاش ہوتی ہے۔ دراصل اس FLIGHT DATA RECORDER کی مدد سے حادثے سے فوراً پہلے کی کیفیت کی ریکارڈنگ کے ذریعے حادثے کا سبب معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ باکس کالے رنگ کا نہیں ہوتا بلکہ اس غرض سے کہ وہ دور سے آسانی سے نظر آ سکے۔ اسے نارنجی رنگ کے پینٹ سے پوت دیا جاتا ہے۔ تو پھر اس نارنجی بکسے کا نام بلیک باکس کیسے پڑا۔ ہوا یوں دوسری عالمی جنگ کے دوران جب اس قسم

کے باکس ہوائی جہاز کے لازمی ساز و سامان کا حصہ بنائے گئے تو رائل ایر فورس کے پائلٹوں نے اس ڈبے کے اندر رکھے ہوئے خفیہ ساز و سامان کے مد نظر مذاق میں اس کا نام بلیک باکس رکھ دیا جو اس کے ساتھ مستقلاً وابستہ ہو گیا۔ کالا رنگ اس میں صرف ایک پُر اسرار کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

"کالی جمعرات" سے کوئی ایسا دن مراد لیا جاتا ہے جس کا کوئی وجود نہ ہو اور جو کبھی نہ آئے۔ نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی کی جانب سے ایس ڈبلو فیلن کی مرتب کی ہوئی مشہور لغت کا ہندی ترجمہ ڈاکٹر کرشنا نند گپت نے "ہندی کہاوت کوش" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں "کالی جمعرات کا وعدہ" کرنا کے تحت یہ تحریر کیا گیا ہے۔ "کالی جمعرات، کرشن پکش کے آخری برہسپت وار کو کہتے ہیں جو مسلمانی مہینے کے آخر میں پڑتا ہے"۔ یعنی قمری مہینے کے نصف آخر میں آنے والی آخری جمعرات۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخری جمعرات کا کوئی وجود ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر ماہ واقع ہوتی ہے۔ جب کہ کالی جمعرات ایک فرضی اور موہوم بات ہے لیکن اس مفہوم میں کالا ہونے اور جمعرات کا باہمی ربط کیا ہے۔ اس سلسلے میں دو قیاسیات کیے جا سکتے ہیں ایک تو جمعرات سے ذہن رات کی طرف جاتا ہے اور رات کالی ہوتی ہے اس لیے کالی جمعرات اور سفید جمعرات کوئی قابل قدر امتیاز نہیں ہے۔ دوسرے یہ ہو سکتا ہے محاورہ ایجاد کرنے والوں نے "کالی جمعرات" کہہ کر "نوچندی جمعرات" سے تضاد پیدا کیا ہو۔ نوچندی جمعرات وہ جمعرات کہلاتی ہے جس پر نیا چاند دکھائی دیتا ہے۔ بعض قسم کی عملیات کی تاثیر کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ نوچندی جمعرات کو ہی کیے جائیں۔ اس لیے "نوچندی جمعرات" کامیابی اور امید بر آری کے امکان لے کر آتی ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں "کالی جمعرات" اپنا وجود نہ ہونے کے سبب بے فیض ہے اور ناکامی اور مایوسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اندھیرے کی تمثیل دینے کے لیے بھی کالے رنگ کو اختیار کیا گیا۔ چنانچہ وہ تنگ و تاریک قید خانہ جس میں سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والے مجرموں کو قید تنہائی میں رکھا جاتا، اسے "کال کوٹھری" کا نام دیا گیا۔ وہ شدید آندھی جس میں گرد و غبار کثرت سے اٹھنے کے سبب اندھیرا ہو جائے وہ "کالی آندھی" کہلائی۔

۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء سے جب کہ دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا، ۸ر مئی ۱۹۴۵ء

تک جب یہ جنگ ختم ہوئی انگلستان میں یہ لازمی رہا کہ ہوائی بم باری سے تحفظ کی ایک تدبیر کے طور پر لوگ رات کے وقت اپنے گھروں کی کھڑکیوں کے شیشوں کو اس طرح ڈھانک کر رکھیں کہ ذرا سی بھی روشنی باہر نہ آسکے۔ سڑکوں اور گھروں کے گرد و پیش اندھیرا رکھنے کی اس کارروائی کو "بلیک آوٹ" کہا گیا لیکن آج اس اصطلاح کو توسیع دے کر اس سے نشر و اشاعت کے میدان میں بھی کام لیا جانے لگا ہے۔ جب کسی مصلحت سے کسی خاص قسم کی خبروں اور اطلاعات کو پوری طرح سنسر کر دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں تک کوئی بات نہیں پہنچنے دی جاتی تو یہ کہا جاتا ہے کہ خبروں کا بلیک آوٹ کر دیا گیا۔

دوسری عالمی جنگ نے "کالے بازار" (بلیک مارکیٹ) کی اصطلاح بھی دی۔ جنگ کے دنوں میں عام اشیائے صرف کی کمی ہو جانے کے باعث چیزوں کا راشن مقرر کر دیا گیا۔ لیکن رات کے اندھیرے میں راشن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بعض لوگوں نے چوری چھپے غیر قانونی تجارت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کاروبار کو کالا بازاری کا نام دیا گیا۔ جنگ تو ۱۹۴۵ء میں ختم ہو گئی لیکن قانون کی نظر سے بچ کر تجارت کرنے اور غلط طریقوں سے منافعہ اکٹھا کرنے کا سلسلہ پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۵ء تک غیر قانونی طور جمع کی ہوئی دولت کی بنیاد پر، ظاہر اور قانونی مالی وسائل پر منحصر معاشی نظام کے متوازی ایک اور معیشت ابھر آئی۔ اسے کالی معیشت (BLACK ECONOMY) کا نام گیا اور کالا دھن (BLACK MONEY) بہت سے ملکوں میں ایک بڑا مسئلہ بن گیا۔

انگریزی زبان سے مستعار لیا ہوا ایک لفظ "بلیک میل" ہے۔ اس کا بھی تعلق غلط طریقے سے پیسے اینٹھنے سے ہے۔ پرانے زمانے میں انگلستان میں ٹیکس یا لگان ادا کرنے کے دو طریقے تھے۔ یا تو چاندی یا چاندی کے سکوں میں ادائیگی کی جائے، جو سفید ادائیگی کہلاتی تھی۔ یا پھر مویشی، جنس، محنت و مزدوری کر کے یا ہلکے سکوں کی شکل میں جسے کالی ادائیگی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ جس زمانے میں اسکاٹ لینڈ کے بعض حصوں کے ناروے کے وائے کنگ لوگوں کا قبضہ تھا، وہ مقامی لوگوں سے جو کہ زیادہ تر کم حیثیت کے لوگ ہوتے تھے اسی قسم کی کالی ادائیگی کی شکل میں خراج وصول کرتے تھے۔ بعد میں اسکاٹ لینڈ کی سرحدوں پر لٹیروں نے لوٹ مار شروع کی۔ جو لوگ وہاں مستقل رہتے تھے یا جو مسافر بغیر ستائے ہوئے سرحد کے آرپار جانا چاہتے تھے وہ ان لٹیروں کو مقررہ رقم ادا کر کے پریشانی سے بچ جایا کرتے

تھے۔ اسے بھی "بلیک میل" کہا جاتا حالانکہ یہ ادائیگی اکثر رائج سکوں میں ہوتی۔ بعد میں لوگوں کو ڈرا دھمکا کر وصول کی جانے والی رقم کے لیے ہی بلیک میل کا لفظ مخصوص ہو گیا۔

قدیم مصر میں کالے رنگ کو ماتمی رنگ کے اعتبار سے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد میں یونانیوں اور رومیوں نے بھی اس رواج کو اپنایا اور مغربی ایشیا میں بھی سیاہ پوشی سوگ کی علامت بن گئی۔ مسیحیوں نے کالے رنگ کو روحانیت سے وابستہ کیا اور زندگی کی لذتوں اور رنگینیوں کو ترک کر دینے کی علامت کی شکل میں پادریوں، راہبوں اور راہباؤں نے کالے رنگ کے رسمی لباس کو اپنایا۔

کالے رنگ کو رسوائی اور نحوست سے بھی وابستہ کیا گیا۔ بعض سماجوں میں مجرموں کو رسوا کرنے اور دوسروں کو غیرت دلانے کے غرض سے مجرم کے منہ پر کالک پوت کر اس کا جلوس نکالا جاتا۔ کبھی مجرم کے سر پر کالی ہانڈی رکھ کر اسے گلی کوچوں میں گھمایا جاتا۔ چنانچہ انتہائی بے حیائی کا کام کرنے کو "کالا منہ کرنے" سے تعبیر کیا جاتا اور "کالا منہ ہونا" "کلنک لگنا" وغیرہ محاوروں نے رسوائی کے معنوں میں جنم لیا۔ رسوائی کے ساتھ ساتھ پٹائی بھی کی جائے اور جسم پر نیلے نشان پڑ جائیں تو کہا جاتا "کالا منہ نیلے ہاتھ پیر"۔

جن لوگوں کو سزائے موت دی جاتی ہوتی یا اپنے مجرمانہ عمل کی بنا پر یا کسی دوسری وجہ سے ناپسندیدہ ریکارڈ ہوتا، ان کے نام بعض اوقات کالی جلد والی ایک نوٹ بک میں درج کر لینے کا یوروپ میں رواج تھا۔ چنانچہ بادشاہ کے ایسے درباری جن کی وفاداری مشتبہ ہو۔ ایسے تاجر جو نادہند ثابت ہوئے ہوں، کارخانے میں ایسے کام کرنے والے جو مالک کے لیے دردِ سر بنے ہوں، اس قسم کی لوگوں کی فہرست کو کالی فہرست (بلیک لسٹ) کہا جاتا۔ اسی طرح جو کسی گروہ میں رہتے ہوئے، اس گروہ کو نقصان پہنچائے جو مزدوروں کے درمیان رہ کر مالکوں کے لیے جاسوسی کرنے یا مالکوں مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مزدوروں میں پھوٹ ڈالے اسے "کالی بھیڑ" (BLACK SHEEP) کا نام دیا جاتا، کیونکہ بعض بھیڑ پالنے والے یہ سمجھا کرتے تھے کہ ان کے گلے میں شامل کالی بھیڑ کے اندر شیطان یا کسی خبیث روح نے حلول کر لیا ہے اور وہ اسے دوسری بھیڑوں کے لیے کسی آفت کا پیش خیمہ سمجھتے اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے۔

ایسا جادو ٹونا جس میں بھوت پریت ' شیطان اور خبیث روحوں کو جگایا جائے اور مذہبی اعتبار سے ممنوعہ طریقے اپنائے جائیں، اسے کالا جادو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو اگر کسی نقصان کی بات کرے اور وہ نقصان ہو کر رہے "اسے کالی زبان" کا کہا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ جس کسی اچھی یا خوش شکل چیز کو دیکھ لیں یا کسی کی کامیابی کو دیکھ کر جل جائیں اور وہ شخص فوراً بری نظر کا شکار ہو جائے اور نقصان اٹھائے تو ایسے لوگوں کو "کالی نظر" والا کہا جاتا ہے اور نظر بد کے اثر کو زائل کرنے کے لیے کالے رنگ کا اکثر استعمال کیا جاتا ہے جیسے بچے کو کاجل کا ٹیکا لگا دیتے ہیں یا بعض ٹرک والے اپنے ٹرک کو کالی چوٹیوں وغیرہ سے سجاتے ہیں۔ اس طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ جن چیزوں میں نقص ہو اُسے نظر بد کا خطرہ نہیں ہوتا۔

آج کل ادبی تنقید کی دہلیز پر بلیک ہیومر (BLACK HUMOUR) کی اصطلاح کھڑی ہے۔ اس قسم کی بے رحم کامیڈی میں موت ' آفت ' قتل، پاگل پن ' جنسی بے اعتدالی جیسے ناگوار موضوعات سے کھلواڑ کی جاتی ہے اور ایک قسم کے شقاوت آمیز مزاح کا تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے فرانسیسی سورلیسٹ ادیب آندرے برے تاں نے ۱۹۴۰ء میں کیا تھا، اسے ۱۹۶۰ء میں ایبسرڈ تھیٹر کے فروغ کے ساتھ مقبولیت حاصل ہوئی اور خاص طور پر یوجین ایونیسکو ' ولادیمر نباکوو اور نتھے نیل ویسٹ جیسے ادیبوں کی تخلیقات کے حوالے سے بلیک ہیومر کی بات کی گئی۔ ایبسرڈ تھیٹر کے ذریعے انسانی زندگی میں کسی واضح نظام کے فقدان کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی اور سنجیدہ وغیر سنجیدہ، "منطقی یا غیر منطقی ' درد و مسرت کی حد بندیوں کو بے معنی ثابت کر کے وجود کی بنیادی بے معنویت کو پہنچنا چاہا۔ بلیک ہیومر بھی سنجیدہ اور غیر سنجیدہ موضوعات کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کے بجائے جو ناگوار ' ناپسندیدہ اور غیر سنجیدہ ہے اس کو مزاح کا وسیلہ بنانے کی ایک کوشش ہے۔

عربی میں "کالا" کے لیے "اسود" کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے ایشیائی ترکی (ایشیائے کوچک) کے شمال میں واقع سمندر کو بحر اسود (BLACK SEA) کہا جاتا ہے۔ اسے پہلے بحر نیطس کہتے تھے لیکن بعد میں غالباً اس وجہ سے کے یہاں طوفان کے ساتھ ساتھ اکثر سطح سمندر پر دُھند چھائی رہتی ہے اور دور سے کچھ بھائی نہیں دیتا۔ اسے بحر اسود یا کالے سمندر

کا نام دیا گیا۔

براعظم افریقہ کا رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک سوڈان ہے۔ دراصل لفظ ''سودان'' عربی لفظ ''اسود'' کی جمع ہے اور کیونکہ اس ملک میں کالی نسل کے لوگ آباد ہیں اس لیے عربوں نے اس ملک کو ''بلاد السودان'' کا نام دیا ہے جسے انگریز اپنی زبان کے ہجوں میں اور تلفظ کے اعتبار سے ''سوڈان'' کہنے لگے۔

اردو میں ''اسود'' پر مبنی جو لفظ سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے وہ مسودہ (م س و۔ ودہ) ہے جسے ہندی میں مسودہ (मसौदा) کی شکل میں اپنا لیا گیا ہے۔ اردو میں مستعمل لفظ تسوید کا اسم مفعول ہے۔ ''تسوید'' کا مطلب ہوتا ہے ''کالا کرنا'' کیونکہ لکھائی کا کام سیاہی سے کیا جاتا ہے اور سیاہی شروع میں چراغ کے کاجل سے تیار کی جاتی تھی اس لیے سیاہی (کالے رنگ کی چیز) کی مدد سے نقش کرنے کے کام کو تحریر کرنے کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔۔ انگریزی میں (TO PUT IN BLACK AND WHITE) اور بول چال کی ہندستانی زبان میں ''کاغذ کالا کرنے'' سے تحریر کرنے کا مطلب لیا جاتا ہے۔ مسودہ تیار کرنے سے ایک خصوصی مفہوم یہ پیدا کیا گیا کہ تحریر اپنی ابتدائی شکل میں ہے اور اس میں کاٹ چھانٹ اور ترمیم واضافہ کے بعد آخری شکل دینے کی گنجایش ابھی باقی ہے۔ یعنی مسودہ وہ ابتدائی خاکہ ہے جس میں بار بار ترمیم کر کے صفحے کو اچھا خاصہ کالا کیا گیا ہو۔ اس کے مقابلے میں مسودے کو آخری شکل دینے کے بعد جو صاف ستھری نقل تیار کی جائے اسے مبیضہ (مُ بی۔ یضہ) کہا گیا۔ مبیضہ کے لغوی معنی ہوتے ہیں ''سفید کیا ہوا''۔ یہاں سفید کرنے سے مراد صاف کرنا ' خوش خط لکھنا ہے۔ ''بیاض'' بھی قریب کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی سفیدی کے ہوتے ہیں جیسے ''بیاض صبح'' (صبح کی سفیدی، روشنی) لیکن بیاض سے ایسی سادہ کاغذوں کی نوٹ بک مراد لی جاتی ہے جس میں یادداشتیں پسندیدہ اشعار وغیرہ قلمبند کیے جا سکیں۔ ساتھ ہی اس نوٹ بک کو جس میں اشعار صاف صاف لکھیں' اسے بھی بیاض کہنے لگے۔

ایک پرانی ہندی کہاوت ہے: ''کالا اکھشر بھینس برابر'' اب اس کا مفہوم کچھ اس طرح لیا جانے لگا ہے جیسے بغیر پڑھے لکھے یا جاہل شخص کے لیے تحریر کی ہوئی عبارت بے معنی ہے۔ وہ کالے رنگ سے لکھے حروف کو بھینس یا کچھ بھی سمجھ سکتا ہے۔ اصل میں

"کالا کھشر" (काला क्षर) سے مراد ایسا حرف یا تحریر تھا جو پڑھنے میں دشواری کا سبب بنے۔ اور یہ کہاوت بد خطی اور اور مغلق، سمجھ میں نہ آنے والی تحریر کے خلاف تنبیہہ تھی۔ کیونکہ اگر آپ بے توجہی کے ساتھ کسی بھی انداز سے اُلٹا سیدھا کچھ گھسیٹ دیں یا بات کو بے وجہ توڑ مروڑ کر، گھما پھرا کر، موٹے موٹے الفاظ، یا بھاری بھر کم اصطلاحات یا پیچدار دلائل سے گراں بار کر کے پیش کریں گے بات تو پڑھنے والے کے لیے کوئی واضح مفہوم پیدا نہیں کر پائے گی اور اسے وہ بھینس، گھوڑا، ریچھ کچھ بھی سمجھ سکتا ہے۔

رنگ برنگ جھنڈیاں بھی بڑے کار آمد اشاروں کی شکل میں استعمال کی جاتی ہیں۔ کالی جھنڈیاں آج کل افسوس، ناراضگی، ماتم، احتجاج اور مخالفت کے اظہار کے لیے کام میں لی جاتی ہیں پہلے۔ بحری قزاق اپنے جہازوں پر کالے جھنڈے لگایا کرتے تھے جن پر بعض اوقات سفید رنگ سے کھوپڑی اور اس کے نیچے ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دو ہڈیاں بنائی جاتی تھیں۔ کھوپڑی اور ہڈیوں کا یہ نشان آج بھی بعض اوقات خطرے کے نشان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، جیسا آپ نے اکثر بجلی کے زیادہ طاقت والے کرنٹ کے سازو سامان پر دیکھا ہوگا لیکن خبر دار کرنے والے ان نشانات کو زیادہ تر سرخ رنگ والی زمین والی تختیوں پر نقش کیا جاتا ہے۔

احتجاج اور غصے کے اظہار کے لیے جس طرح کبھی کبھی "مردہ باد" کے نعرے لگائے جاتے ہیں، اسی طرح ناراضگی کے اظہار کے لیے سوگ کو ظاہر کرنے والی کالی جھنڈیاں دکھائی جاتی ہیں یا کالی پٹیاں بازو پر باندھی جاتی ہیں۔

کالے کے مقابلے میں سفید رنگ کو سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ خیر و شر اور نیک و بد کو سفید و سیاہ کے تضاد سے ظاہر کیا جاتا ہے اور کسی کے سفید و سیاہ کے مالک ہونے سے مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اچھے اور بُرے سب کا ذمہ دار ہے اور اسے کامل اختیار حاصل ہے۔

سفید کو نیکی، بے گناہی، معصومیت اور پاکیزگی کی علامت مانا جاتا ہے۔ مغرب میں دُلھن کے باعصمت ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے اسے روایتی سفید لباس میں ملبوس کیا جاتا ہے۔ ہندستان میں سوگ کے موقع پر بھی سفید لباس کو ترجیح دی جاتی ہے تاکہ موقع کے سنجیدگی کے موافق چمک بھڑک سے پرہیز کو ظاہر کیا جا سکے۔ بیواؤں کو بدنصیبی اور

عیش و نشاط کو ترک کرنے کے ان کے عزم کو ان کا روایتی سفید لباس بتاتا ہے۔ سفید جانوروں اور سفید پرندوں کو اسی طرح مبارک شگون کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے۔ سفید کبوتر کو امن اور چین کا علامت سمجھا جاتا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں سفید ہاتھی کو خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ سفید ہاتھی کو کیوں مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق رابرٹ ڈیل راٹ ROBERT DELROT نے اپنی کتاب THE LIFE AND LOVE OF THE ELEPHANT میں یہ روایت درج کی ہے کہ گوتم بدھ کی والدہ رانی شری مہامایا نہایت حسین اور پاکباز خاتون تھیں۔ گرمیوں کی ایک پونم کی رات میں انھوں نے خواب دیکھا کہ ایک کھٹولے پر انھیں ہمالیہ کی چوٹی پر ایک شاندار محل میں لے جایا گیا۔ محل میں چاندی کی طرح سفید ایک ہاتھی ہمالیہ کی بلندی سے اُتر کر آیا اور مہارانی کے کمرے میں داخل ہو کر ان کے سامنے جھک کر پرنام کیا۔ اس کی سونڈ میں ایک کنول کا پھول تھا جو اس نے مہارانی کے بطن میں رکھ دیا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد لمبنی کے ایک خاموش اور پُر فضا باغ میں مہارانی نے بلا تکلیف گوتم بدھ کو جنم دیا۔ چنانچہ سفید ہاتھی کو میانمار (جسے پہلے برما کہتے تھے) تھائی لینڈ (جسے پہلے سیام کہتے تھے) اور لاؤس وغیرہ علاقوں میں گوتم بدھ کی پیدائش کی روایت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے بڑا مقدس مانا جاتا ہے یہاں تک کہ قدیم سیام جھنڈے پر بھی ہاتھی کی شکل ہوتی تھی۔ سفید ہاتھی کو جو کہ بہت کمیاب ہوتا ہے صرف بادشاہ پالا کرتا تھا۔ اس کی خدمت بڑے ٹھاٹ باٹ سے ہوتی تھی۔ اور اس کی خدمت کے لیے متعدد نوکر تعینات رہتے تھے۔ جب بادشاہ اپنے کسی درباری سے ناراض ہو جاتا تو وہ اس درباری کو ایک سفید ہاتھی بخش دیا کرتا تھا۔ درباری سفید ہاتھی کی دیکھ ریکھ میں غفلت برت نہیں سکتا تھا کیونکہ مقدس ہاتھی کو تکلیف میں رکھنے سے بڑا کوئی گناہ نہیں تھا۔ دوسرے بادشاہ کے دیے ہوئے تحفے کی ناقدری بھی ایک سنگین جرم تھا۔ چنانچہ سفید ہاتھی کے شایانِ شان دیکھ بھال سے درباری کا دیوالیہ نکل جاتا اور وہ پوری طرح تباہ ہو جاتا۔ چنانچہ جو ذمے داری سنبھل نہ سکے اور تباہی کا باعث بن جائے اس کے سفید ہاتھی بن جانے کی مثال دی جانے لگی۔

اردو میں صاف اور صریح جھوٹ کو "سفید جھوٹ" کہا جاتا ہے۔ اردو میں یہ محاورہ انگریزی سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن معنی میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ یورپ میں

رائج ضابطۂ اخلاق کے مطابق جھوٹ بولنا قابل تعزیر جرم تھا لیکن جھوٹ کی دو قسمیں مانی گئی تھیں۔ ایک وہ جھوٹ جو کسی گناہ کو چھپانے، کسی کو دھوکا دینے یا کسی کو نقصان پہنچانے کی نیت سے بولا گیا ہو۔ اس جھوٹ کی سزا واجب تھی۔ دوسرا جھوٹ وہ تھا جو اچھی نیت سے بولا گیا ہو، جو کسی کو نیکی کی ترغیب دلانے، کسی کی پردہ پوشی کر کے اسے احسان کے دباؤ سے اصلاح پر آمادہ کرنے یا کسی قسم کے شر یا فتنے کو پھیلنے سے بچانے کی غرض سے بولا گیا ہو۔ اسے قابل معافی سمجھا جاتا تھا۔ اس دوسرے قسم کے جھوٹ کو سفید جھوٹ کہا جاتا تھا اور اس کے سزا نہیں تھی۔ اردو میں "سفید جھوٹ" کا فقرہ تو اپنا لیا گیا لیکن اس کا مفہوم بالکل بدل گیا۔

سفید پوشی سے سماج کے اس طبقے کی طریق زندگی کے جانب اشارہ مقصود ہوتا ہے جس کے افراد کو معاش کے لیے کھیتوں یا کارخانوں، دھندوں یا حرفتوں میں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ایسا کام کرنا جس میں کپڑے داغدار ہوں اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پچھلے زمانے میں شرفا میں گنا جاتا تھا۔ آج کل انگریزی میں WHITE COLLAR JOB کا ایک محاورہ رائج ہے جس کا اطلاق انتظامی شعبے سے تعلق رکھنے والے ان افسروں اور بابوؤں پر ہوتا ہے جو کرسی اور میز پر بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ انھیں کارخانے یا میدان میں کیے جانے والے اس کام سے کوئی غرض نہیں ہوتی جس میں ہاتھ یا کپڑے گندے ہوں۔ ان کا سارا کاروبار قلم کے سہارے چلتا ہے۔

جب سرکاری طریق کار کی بات آئی ہے تو "قرطاس ابیض" کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ قرطاس ابیض یا WHITE PAPER اس رپورٹ کو نام دیا جاتا ہے جو حکومت کسی مسئلے پر اپنی پالیسی کو بتانے کے لیے شائع کرتی ہے تاکہ اس پر پارلیمنٹ میں غور کیا جا سکے۔ وہائٹ پیپر شائع کرنے کا طریقہ برطانوی پارلیمنٹ سے لیا گیا ہے اور اسے وہائٹ پیپر پارلیمنٹ کی ایسی دوسری دستاویزوں سے ممتاز کرنے کے لیے کہا جاتا ہے جنھیں الگ الگ رنگوں کی جلدوں (COVERS) میں پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے گرین پیپر جن کی شکل میں حکومت اپنی تجاویز کی ابتدائی رپورٹ پارلیمنٹ میں بحث کے لیے پیش کرتی ہے اور بلیو بک (Blue Book) جس کی شکل میں پارلیمنٹ کی ایسی دستاویزات شائع کی جاتی ہیں جن پر بحث ہو چکی ہے اور جو اب قابل نفاذ ہیں ان کتابوں کی شروع میں نیلے رنگ سے جلد بندی کی

جاتی تھی کیونکہ نیلا رنگ شاہی رنگ سمجھا جاتا تھا۔ سفید چھڑی کو اب عالمی سطح پر نابینا لوگوں کی پہچان کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ دورِ حاضر کی بھاگم بھاگ اور تیز رفتار ٹریفک میں نابینا لوگوں کو سڑک پر جن خطرات کا سامنا تھا ان سے بچنے کے لیے دوسری عالمی جنگ کے بعد سفید چھڑی تحریک نے ایک بڑا مفید کردار ادا کیا ہے۔

سفید جھنڈی شکست تسلیم کر لینے یا صلح کی پیش کش کے لیے دکھائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو فریق سفید جھنڈا یا جھنڈی دکھا رہا ہے اور وہ اب خون خرابہ یا جنگ و جدل نہیں چاہتا۔ یہاں انگریزی کے ایک محاورے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا SHOW A WHITE FEATHER TO (سفید پر دکھانا) بزدلی دکھانے اور شکست مان لینے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ محاورہ مرغ بازی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ جو مرغ اپنی دم کے بال کھڑے کر کے یہ دکھاتا ہے کہ ان میں ایک سفید پر ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اصیل نہیں ہے اور جلدی پالی چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

اردو میں لہو سفید ہو جانے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ خون میں فطری سرخی باقی نہیں ہے اس سے اس جانب اشارہ مقصود ہوتا ہے کے خون کے رشتوں کا پاس کرنے کا وہ جوہر نہیں ہے جو اصل سرخ خون کا وصف ہے۔ چنانچہ جو شخص قرابت داری کا خیال نہ رکھے اور اپنے رشتہ داروں کی حق تلفی کرے اور انھیں نقصان پہنچائے اس کا خون محض سفید ' بے رنگ پانی ہے۔ اسی طرح خوف و دہشت سے چہرے کا رنگ فق ہو جانے کو خون سوکھ جانے اور چہرہ سفید پڑ جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سفیدی کو بڑھاپے کی علامت کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ بڑھاپے کے ساتھ ساتھ بال سفید ہونے لگتے ہیں اور سفیدی آنے کو بڑھاپا آنے کے محاورے کی شکل میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف سرخ و سفید ہونا ' تندرست و فربہ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور صحت مندی 'جوش ' غصے یا شرم سے جب دوران خون تیز ہونے کی وجہ سے گلابی رنگت ابھر آتی ہے تو اس سے ان کیفیتوں کو ظاہر کرنے والے کئی محاورے جنم لیتے ہیں جیسے غصے سے لال پیلا ہونا یا لال آنکھیں دکھانا۔ چہرہ سرخ ہونے کی ایک وجہ کامیابی سے ہونے والی خوشی بھی ہو سکتی ہے چنانچہ سرخ رو ہونے یا سرخ روئی کو کامیابی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

خون بہنایا بہانا جان کے لیے سنگین خطرے کو ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ سرخ رنگ کو خطرے کی نشانی کے طور پر اختیار کر لیا گیا۔ اور سرخ جھنڈی کو خطرے سے خبردار کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان اور امریکا میں ان عمارتوں کے سامنے لال بتی لگانا ضروری قرار دیا گیا جہاں شراب جوا اور اسی قسم کے دوسرے دھندے ہوتے تھے۔ اسی رواج کے تحت جسم کا دھندا کرنے والی عورتوں کے کمروں اور چکلوں کے سامنے بھی لال بتی لگائی جانے لگی ور طوائفوں کے محلوں کو لال بتی کے علاقے (RED LIGHT AREAS) کہنے لگے۔

انقلاب فرانس کے دوران سرخ رنگ کے جھنڈے کو خونی انقلاب کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا انقلابیوں کو فرانس کے اُمراء کے کشت و خون کی نمایش سے ایک خاص قسم کی آسودگی حاصل ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ امراء کے قتل کے بعد ان کے خون سے اپنے ہاتھ خوب رنگتے اور اوپر اٹھا اٹھا کر سب کو دکھاتے اور خوشی کے نعرے لگاتے۔ انقلاب روس کے دوران بھی سرخ جھنڈے کو اپنایا گیا لیکن اس ترجیح کا باعث صرف کشت و خون میں لذت کو سمجھنا ٹھیک نہ ہوگا۔ روسیوں کے لیے سرخ رنگ حسن و خوبصورتی کا رنگ بھی ہے اور روسی زبان میں سرخ رنگ اور خوبصورت و نظر فریب کے لیے جو الفاظ آتے ہیں وہ قریب کے ہیں۔ سرخ رنگ کو روسی میں "کراس نویہ" اور خوبصورت کو "کراسی ویہ" کہتے ہیں۔ ماسکو کا "لال چوک" سرخ انقلاب آنے سے تین سو سال پہلے سترھویں صدی میں بھی لال یا خوبصورت چوک کہلاتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انقلابی روس کے سرخ جھنڈے کے ساتھ ساتھ سرخ رنگ سوشلزم اور مزدور طاقت کی علامت بن گیا اور آج بھی جب کہ سودیت یونین منتشر ہو چکی ہے۔ برطانوی لیبر پارٹی اپنے ترانے میں لال جھنڈے کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرتی ہے۔

سرخ رنگ غلبے کی بھی علامت ہے جس زمانے میں دنیا کے طول و عرض پر برطانوی سامراج پھیلا ہوا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ سلطنت برطانیہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا، اس وقت دنیا کے نقشے پر برطانیہ اور برطانوی عملداریوں کو سرخ رنگ سے ہی دکھایا جاتا تھا اور آج بھی ۱۲۹ ملکوں کے قومی جھنڈوں میں سرخ رنگ شامل ہے۔

پہلی۔ قلمی کتابوں اور دستاویزات وغیرہ میں عام تحریر کے لیے یوں تو سیاہی کو

استعمال کیا جاتا تھا لیکن جس عبارت پر خصوصی توجہ دینا مقصود ہوتی تھی اس کے لیے سرخ یا شنجرفی روشنائی کو کام میں لایا جاتا تھا۔ بیوپاری اپنے کھاتوں میں ان رقموں کو جو رکی پڑی ہوں، جو قرضے واپس نہیں ہوئے ہوں جو رقمیں ڈوب گئی ہوں اور گھاٹا ہوا ہو، ان سب کو سرخ رنگ سے دکھاتے۔ اسی طرح آمد و خرچ کی میزان کو سرخ روشنائی سے لکھنے کا رواج پڑ گیا۔ کتابوں کے عنوانات وغیرہ کو سرخ رنگ سے لکھا جاتا یہاں تک کہ آج بھی ہم اخبارات میں خبروں کے عنوانات کو سرخیاں کہتے ہیں اور اہم اور نہایت جلی قلم سے لکھی گئی سرخی کو شاہ سرخی کا نام دیتے ہیں۔

سرخ رنگ کو خوشی اور خوش بختی کا رنگ بھی مانا جاتا ہے۔ ہندستان میں سندور، سرخ بندی، سرخ چوڑیاں اور سرخ جوڑا دلہن کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے اور اسے سہاگ کی نشانی سمجھتے ہیں لیکن شادی کے بعد بچوں کی پیدائش پر روک لگانے کی ترغیب دلائی جاتی ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کے لیے لال تکون کی علامت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ لال تکون اس لال لنگوٹ کی نمائندگی کرتا ہے جو پکے برہم چاری باندھتے ہیں اور مجرد زندگی پر اپنے کامل اعتقاد کو پختہ کرتے ہیں۔

لال فیتہ شاہی آج گفتگو کا عام موضوع بن چکی ہے۔ سترھویں صدی میں انگلستان میں دستاویزات اور دوسرے ضروری کاغذات کو لال فیتے سے باندھ کر رکھنے کا رواج ہوا۔ اس زمانے میں جن دستاویزوں کو مستقل رکھنا ہوتا تھا اور انھیں دائمی ریکارڈ بنانا مقصود ہوتا تھا انھیں لال فیتے سے کس کر باندھ دیا جاتا تھا۔ ان دستاویزات کو رسی سے باندھنے سے اس لیے پرہیز کیا جاتا تھا کہ سختی سے باندھنے پر دستاویزات کے کاغذ کے کنارے سے پھٹنے کا ڈر تھا۔ چوڑے فیتے کے استعمال سے یہ اندیشہ نہیں رہتا تھا۔ لال رنگ سے یہ خبردار کرنا مقصود تھا کہ ان کاغذات کو ایسے کاغذات کے ساتھ ضائع نہ کر دیا جائے جن کی اب ضرورت نہیں رہی لیکن بعد میں دفتروں میں فوری نوعیت اور مستقل اہمیت کے سبھی کاغذات کو لال فیتے سے باندھا جانے لگا اور کاغذات کے انبار سے ضرورت کے کاغذات کو نکالنا دشوار ہو گیا۔ اس کی وجہ سے دفتری کارروائی میں بھی زیادہ وقت لگنے لگا۔ انیسویں صدی میں انگریزی ناول نگار چارلس ڈکنس نے اپنے ناولوں میں لال فیتہ شاہی کا ذکر کیا۔ لیکن لال فیتہ شاہی کے نظام پر بھرپور حملہ ڈکنس کے ہمعصر ٹامس کارلائل نے کیا۔ آج

لال فیتہ شاہی دفتری کارروائی کی پیچیدگیوں اور بے مطلب ضابطے کی کارروئیوں کی علامت بن گئی۔

لیکن لال رنگ سے ممتاز جس تنظیم نے دُکھی انسانیت کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا وہ ریڈ کراس ہے۔ یوں تو جب چودھویں صدی کے وسط میں پلیگ (طاعون) کے مرض سے انگلستان نے تباہی مچائی (انگریزوں نے اسے بلیک ڈیتھ یا کالی موت کا نام دیا تھا) اس وقت جن گھروں میں پلیگ کے مریض ہوتے تھے ان کے دروازوں پر لوگوں کو خبردار کرنے کی غرض سے لال کراس کا نشان لگا دیا جاتا تھا۔ لیکن یہاں ہم جس تنظیم کا حوالہ دے رہے ہیں وہ سوئٹزرلینڈ کے ایک باشندے ژاں ہنری دیوناں (JEAN HENRI DU-NANT) کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ دیوناں نے ۱۸۵۹ء میں فرانس اور اٹلی کے درمیان سال فےری نو میں ہونے والی لڑائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لڑائی میں تقریباً تیس ہزار سپاہی مارے گئے یا زخمی ہوئے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں اس نے "سال فےری نو کی یاد" عنوان سے ایک کتاب شائع کی اور لڑائیوں میں زخمی ہونے والوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک مستقل تنظیم قائم کرنے کی تجویز رکھی۔ اس کے نتیجے میں ۱۸۶۴ء میں ریڈ کراس تنظیم کا قیام عمل میں آیا اور اسی سال منعقد ہونے والے جینوا کونیشن میں لڑائی میں زخمی ہونے والے لوگوں کی خیر و خبر اور علاج و معالجے کے سلسلے میں اہم فیصلے کیے گئے۔ اس تنظیم نے اپنی علامت کی شکل میں جس لال کراس کو اختیار کیا گیا وہ دراصل سوئٹزرلینڈ کے قومی جھنڈے کی الٹی شکل ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے جھنڈے میں لال زمین پر سفید کراس ہوتی ہے۔ دیوناں نے اپنی تنظیم کے لیے سفید زمین پر لال کراس کو اپنایا۔ کیونکہ کراس مسیحی مذہب سے تعلق رکھنے والی ایک علامت ہے اس لیے مسلم ممالک نے اسے اختیار کرنا پسند نہیں کیا۔ چنانچہ مسلم ممالک میں یہ تنظیم ہلال احمر (RED CRES-CENT) کے نام سے کام کرتی ہے۔

گلابی رنگت نرمی کو ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ گلابی جاڑا ایسا موسم ہوتا ہے جس میں سردی کی پوری شدت اُبھر نہیں آتی اور اس ہلکی خنکی میں بڑا مزہ آتا ہے۔ بھوپال کے ایک صاحب طرز ادیب ملا رموزی (۱۸۹۹ء تا ۱۹۵۲ء) نے ۱۹۵۳ء کے قریب قرآن حکیم کے قدیم اردو تراجم کے انداز پر ایک اسلوب ایجاد کیا تھا جس کی شگفتگی کے مدنظر انھوں

نے اسے "گلابی اردو" کا نام دیا تھا۔

لال کے مقابلے میں اکثر ہرے رنگ کو استعمال کیا جاتا ہے جیسے اگر لال جھنڈی یا لال بتی خطرے سے آگاہ کرتی ہے یا رُکنے کو کہتی ہے تو ہری جھنڈی یا ہری بتی خطرہ دور ہو جانے اور چل پڑنے کے نشان کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ ہرے رنگ کو بالعموم ہرے بھرے درختوں، سر سبزی و شادابی اور بہار کے موسم یا ساون کے مہینے میں بارش کی وجہ سے دکھائی دینے والی ہریالی کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے، جیسے کہاوت ہے "ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے"۔ ہرا رنگ پودوں اور درختوں کی بھرپور نشو و نما اور ان کے پھلنے پھولنے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر ہرے رنگ سے خوشحالی اور ترقی کی نشان دہی کی جاتی ہے اور "ہرے بھرے رہو" کو خوش حال اور خوش خرم رہنے کے لیے ایک دعا کی طور پر بولا جاتا ہے۔ بچے کی امید ہونے کے لیے عورتیں "گود ہری ہونا" کا محاورہ بولتی ہیں اور شادی کے گیت گاتے ہوئے دولہا کے لیے "ہریالا بنا" کا خطاب استعمال کیا جاتا ہے جس میں دولہا کی خوشحالی اور اس کے صاحب اولاد ہونے کی نیک خواہشات شامل ہوتی ہیں۔ "سبز بخت" کا فقرہ خوش نصیب اور خوش حال کے لیے بولا جاتا ہے۔

ماحول کے توازن کو برقرار رکھنے کی تحریک کے ساتھ ساتھ ہرے رنگ نے ایک نئی معنویت حاصل کی ہے چنانچہ شہروں کو ہرا بھرا رکھنے، جنگلوں کی اندھا دھند کٹائی پر روک لگانے اور بڑے پیانے پر نئے پودے لگانے کی ترغیب دلانے والے اشتہارات، پوسٹروں اور پیغامات سے ہمارا روز سامنا ہوتا ہے اور ہرا رنگ آلودگی سے پاک فضا اور صنعتی دور کی سفاکیوں سے محفوظ فطرت سے منسلک ہو گیا ہے۔ شہروں کی ہری پٹی (GREEN BELT) کو برقرار رکھنے پر زور دیا جا رہا ہے اور وقتاً فوقتاً گرین پیس GREEN PEACE کے رضاکاروں کی کارروائیوں کے بارے میں پڑھنے یا سننے کو ملتا ہے۔ گرین پیس تحریک نے ۱۹۷۷ء میں جنم لیا اور جوہری دھماکوں، فاضل جوہری مادوں کے سمندر میں پھینکے جانے، وھیل مچھلیوں کے شکار اور دوسرے جانداروں کو نابود کرنے والے پروگراموں کی کی پوری شد و مد سے مخالفت کرنا اس نے اپنا نصب العین بنایا۔

سبز رنگ کو کھیتی باڑی اور بہتر زراعتی پروگراموں کے ذریعے لائی جانے والی خوش حالی سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ گذشتہ ۳۰-۲۵ برسوں کے دوران سبز انقلاب (GREEN

REVOLUTION) نے دنیا میں زراعت کا نقشا ہی بدل دیا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر نارمن بارلاگ (NORMAN E. BORLAUG) نے میکسیکو میں کام کرنے کے دوران گیہوں، چاول، مکا اور دوسرے اناج کی بہتر قسمیں پیدا کرنے پر خاص زور دیا۔ زیادہ پیداوار دینے والے اور فصل کی جلد تیار ہونے میں مدد دینے والے بیج استعمال کر کے، کیمیاوی کھاد کے مناسب استعمال اور آبپاشی کے بہتر انتظامات کے ذریعے غذائی حالات کو بہتر بنانے کا ان کا منصوبہ یقیناً انقلابی ثابت ہوا اور اس سے ہندستان، پاکستان، سری لنکا، میکسیکو، فلپائن وغیرہ ترقی پذیر ممالک میں بڑا فائدہ اٹھایا گیا اور اس زبردست کام کے اعتراف میں ڈاکٹر بارلاگ کو ۱۹۷۰ء میں امن کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔ ہندستان میں سبز انقلاب کے پروگرام پر ۱۹۶۶ء کی خریف فصل کے ساتھ عمل کیا گیا اور اس کے امید افزا نتائج حاصل ہوئے۔

سبز انقلاب کے پیمانے پر سفید انقلاب لانے کا بھی پروگرام بنایا گیا جس کا تعلق دودھ کی پیداوار میں اضافہ کرنے سے ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر ورگھیس کوریَن (-VER GHESE KURIEN) کے زیر ہدایت آپریشن فلڈ (OPERATION FLOOD) کی ابتدا کی گئی اور اس زبردست کام کے لیے انھیں ۱۹۸۹ء میں عالمی خوراک انعام (WORLD FOOD PRIZE) اور ۱۹۶۳ء میں میگ سائے سائے انعام ملے اس کے علاوہ اب مچھلیوں کی افزائش کے پروگرام کو توسیع دے کر نیلا انقلاب لانے بات سننے میں آتی ہے۔

لیکن ہرے رنگ کا دوسرا پہلو بھی ہے جہاں وہ درد و غم و نحوست کا پیش خیمہ بن کر آتا ہے۔ بہار کے سرسبز موسم میں کلیاں چٹکتی ہیں اور پھول کھلتے ہیں لیکن اگر زخم چٹکتا ہے تو ٹیس ہوتی ہے اور درد کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ جب زخم بھرنے کی جگہ پھر سے پھٹ جائے، پرانی چوٹ پھر سے درد کرنے لگے تو کہتے ہیں کہ زخم ہرا ہو گیا اور کسی کو جسمانی طور پر شدید تکلیف پہنچانے یا بُرا بھلا کہہ کر، طنز و تشنیع سے کسی کے دل کو چوٹ پہنچانے کو محاورے میں متاثر شخص کی "طبیعت ہری کرنا" کہا جاتا ہے۔

اہل فارس بعض اوقات ہرے رنگ کو کالے رنگ کی طرح گہرا رنگ تصور کرتے ہیں اور کالے رنگ کی طرح اسے نحوست، سوگ، غم اور دنیاوی علائق سے بے تعلقی کی علامت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جس شخص کی آمد سے نحوست پیدا ہو۔ اسے "سبز قدم" کہا جاتا

ہے۔وہ درویش جو دنیا اور دنیاوی اسباب کو حقیر سمجھ کر فقیرانہ زندگی گذارتے ہیں وہ بعض اوقات سبز لباس پہننا پسند کرتے ہیں اور سبز پوشی کو ماتمی حالت میں ہونے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ جس شخص کی آنکھیں کرنجی ہوں اسے سبز چشم کہتے ہیں۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ ایسی آنکھوں والا شخص بڑا بے مروت ہوتا ہے۔ اردو میں سبز کو طوطے سے تشبیہ دیتے ہوئے سبز چشم کو اکثر طوطا چشم کہا جاتا ہے اور طوطا چشمی کو بے مروتی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کبھی سبز رنگ کو دھوکا دینے سے جوڑ لیا جاتا ہے۔ ایک محاورہ ہے "سبز باغ دکھانا" دراصل یہ ان شعبدہ گروں کے نظر بندی کے کھیل سے لیا گیا ہے جو ایک چادر تانتے ہیں اور پھر اسے آہستہ آہستہ نیچے سے اوپر سرکاتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ چادر کے پیچھے ایک ہرا باغ اگ رہا ہے جب کہ حقیقت میں وہاں کچھ نہیں ہوتا ہے وہ ذہن میں صرف ایک وہم پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ شخص جو جھوٹے وعدوں سے ہمیں امید برآری کی توقع دلاتا ہے۔وہ بھی ہمارے دماغ میں ایک خوبصورت وہم پیدا کرتا ہے اور سبز باغ دکھاتا ہے۔

ہرے رنگ کو آج کل اسلامی رنگ کی حیثیت دی جاتی ہے اور اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایسے ۲۹ ملکوں کے قومی جھنڈوں میں ہرا رنگ نمایاں طور پر شامل ہے جہاں مسلم آبادی کافی بڑی تعداد میں ہے۔ لیبیا کا جھنڈا تو ایسا ہے جس میں صرف ہرا رنگ ہی ہے۔ اس رنگ کے کپڑے پر کسی اور رنگ کی کوئی پٹی، کوئی شکل، کوئی نشان یا کوئی عبارت نہیں ہے لیکن سبز رنگ ہمیشہ سے اسلامی پرچم کی مستقل خصوصیت نہیں رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کالے رنگ کے پرچم یا فتح مکہ کے موقع پر سفید پرچم استعمال کیے گئے۔ امام حسینؑ کے رفقاء نے البتہ کبھی سبز مستطیل اور کبھی سبز مثلث پرچم کا استعمال کیا۔ یزید کی فوج کے پرچم سیاہ تھے۔ عباسیوں نے بھی کالے پرچم کو اپنایا خارجیوں کے جھنڈے سرخ تھے۔ ہاں دسویں صدی عیسوی میں جب مصر کے فاطمیوں نے جھنڈے کے لیے ہرے رنگ کا انتخاب کیا تو اس کے بعد سے یہ رنگ مسلم طاقتوں کے جھنڈوں پر چھا گیا۔

چلتے چلتے گرین روم کا ذکر کر لیا جائے۔ تھیٹر میں کھیل میں حصہ لینے والے فنکاروں کے اپنے استعمال کے لیے ایک کمرہ ہوتا ہے، یہاں وہ اپنا لباس بدلتے ہیں یا میک

اپ کرتے یا اُسے بدلتے ہیں۔ اسے گرین روم کہا جاتا ہے، کیونکہ اولاً اسے ہرے رنگ سے پوتنے کا رواج تھا۔ جب یہ آرٹسٹ اسٹیج پر کام کرتے تھے تو انھیں اسٹیج کی تیز روشنی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور اس کی چکاچوند سے اُن کی آنکھوں پر زور پڑتا تھا۔ اس لیے اسٹیج سے پیچھے بنے فنکاروں کے کمرے کی دیواروں اور چھت کو ہرے رنگ سے پینٹ کیا جاتا تھا تاکہ اسٹیج کی تیز روشنی میں کام کر کے لوٹنے والے فنکاروں کی آنکھوں کو سکون پہنچے۔

نیلا رنگ آسمان کا ہے اور سمندر میں آسمان کا عکس نظر آتا ہے اس لیے سمندر کا رنگ بھی نیلا دکھائی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے نقشوں میں سمندروں، جھیلوں اور ندیوں کو نیلے رنگ سے دکھایا جاتا ہے۔ یوروپ کے جہازراں عام طور پر نیلے رنگ کے موٹے کپڑے کے لباس پسند کرتے تھے۔ اس لیے نیلی جنس اور نیلی جیکٹوں کا رواج ہوا۔ بحریہ (NAVY) میں نیلے یونیفارم کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی مناسبت سے مچھلیوں کی پیداوار میں اضافے کے پروگرام کو نیلے انقلاب (BLUE REVOLUTION) کا نام دیا گیا۔

چوٹ لگنے پر کھال پر جو خون جم جانے سے نشان پڑتا ہے اسے بھی نیلے رنگ سے تشبیہ دی گئی ہے اور "نیل ڈالنے" کا مفہوم مار پیٹ کر زخمی کرنا لیا گیا ہے۔ شدید غصے سے چہرے کی رنگت بدل جانے کو اسی طرح "نیلا پیلا ہونا" کہا گیا۔ سردی کی وجہ سے یا خون کی کمی کی بنا پر جسم کی رنگت بدل جانے کو چہرے یا ہاتھ نیلے پڑنے کی مثال دی گئی اور کبھی کبھی اسے موت کے قریب ہونے کی علامت سمجھا گیا۔

بلیو پرنٹ تیار کرنے سے آج کل کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تفصیلات کو طے کرنے کا مفہوم لیا گیا ہے۔ یہ فقرہ اس خاکے سے لیا گیا ہے جو انجینئر وغیرہ مکان یا کسی قسم کی مشین یا ڈھانچے کو تیار کرنے سے پہلے اس کے سارے حصوں اور پرزوں کو ان کی ضروری پیمائش اور شکل کو دکھاتے ہوئے بنایا جاتا ہے لیکن بلیو پرنٹ کا نام اس طریقے سے تعلق رکھتا ہے جو ان نقشوں کی کاپیاں نکالنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ۱۸۴۲ء میں سر جان ہرشل نے نکالا تھا اور اس میں پوٹے سیم فے ری سائے نائڈ (POTASSIUM FERRICYANIDE) اور فے رک سالٹ (FER-RIC SALT) کی مدد سے خاص طور پر تیار کئے گئے کاغذ یا کپڑے پر جھلک دار کاغذ پر بنے نقشے کو رکھ کر ایسی نقل نکالی جاتی ہے جس میں نیلے پس منظر میں سفید رنگ کے اندر نقشا

اور عبارت ابھر آتی ہے۔

بلیو پرنٹ میں تو نیلا رنگ دکھائی دیتا ہے، لیکن بلیو فلم میں نیلا رنگ نہ ہوتے ہوئے بھی نیلے سے مناسبت پیدا کی جاتی ہے۔ایسی فلمیں جن میں فحش اور عریاں مناظر ہوں انھیں اشارۃً بلیو فلم کہا جاتا ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں جن عورتوں کو بد چلنی یا عصمت فروشی کے جرم میں قید کی سزا دی جاتی تھی انھیں پہننے کے لیے جو یونیفارم دیا جاتا تھا وہ نیلے رنگ کا ہوتا تھا۔اسے نیلا رنگ فحشیات کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور فحش مذاق اور فحش کہانیوں، فحش تصاویر کو "بلیو" رنگ سے نسبت دی جانے لگی۔ انیسوی صدیں کے نصف آخر میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں فحشیات کو بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا اور ہر ایسی چیز کی جس پر فحاشی کا ذرا سا بھی شبہ ہوتا تھا سختی سے پکڑ دھکڑ ہوتی تھی یہاں تک کہ فحاشی کا تذکرہ بھی بڑا گھما پھرا کر کیا جاتا تھا اور اس قسم کی باتوں کے لیے ایک بڑی محتاط اشاروں کی زبان وضع کرلی گئی تھی۔اسی کی ایک مثال فحاشی "بلیو" سے تعبیر کیا جانا ہے۔اس پابندی کے ردِ عمل کے طور پر وکٹورین عہد فحشیات کے عروج کا بھی دور رہا۔اسی زمانے میں پہلے فوٹو گرافی اور بعد میں فلم سازی کو فروغ حاصل ہوا اور بیسویں صدی کے ربع اول میں جب فحش فلمیں بھی بننے لگیں تو انھیں بھی اشارۃً بلیو فلم کا نام دیا گیا۔

۱۹۴۵ء کے بعد نیلے رنگ کو اس وقت ایک نیا اعتبار حاصل ہوا جب تنظیم اقوام متحدہ نے اپنے جھنڈے کے لیے اس رنگ کو اختیار کیا۔ سفید رنگ کو صلح و امن کے رنگ کی حیثیت سے پہلے ہی تسلیم کیا جا چکا تھا اور اسے ریڈ کراس اور اولمپک کھیل تحریک وغیرہ جیسی فلاح و تعاون کی تنظیموں کے جھنڈے کے لیے اپنایا جا چکا تھا۔دوسرے رنگوں کی بھی علامتی معنویت طے ہو چکی تھی۔ اس لیے ہلکا نیلا رنگ جو آسمان کی بلندی اور پہنائی کی نمائندگی کرتا ہے ایک اچھا انتخاب ثابت ہوا۔

دوسرے ہلکے رنگوں میں پیلا رنگ سفید رنگت سے قریبی مماثلت رکھتا ہے لیکن اپنے پھیکے پن کی وجہ سے پیلے رنگ کو اکثر مریضانہ تاثر اور مردنی سے وابستہ کیا گیا۔ خون کی کمی سے چہرے پر سرخی نہ رہنے کو چہرے کے پیلا پڑ جانے سے تعبیر کیا گیا۔اسی طرح خوف، شرمندگی اور خجالت کے تاثر کو زرد روئی کا نام دیا گیا۔ جگر کی خرابی سے خون کے

سرخ ذرّات کی بہت زیادہ کمی واقع ہونے کی وجہ سے یرقان (JAUNDICE) کی بیماری ہو جاتی ہے اور آنکھوں اور ناخنوں پر بھی زردی دکھائی دینے لگتی ہے۔ اسی وجہ اس بیماری کو عام زبان میں پیلیا کہا جاتا ہے۔ گرم آب وہوا کے علاقوں میں کبھی یرقان کے ساتھ کالے رنگ کی قے اور شدید بخار کے ساتھ ایک بیماری پھیلتی ہے۔ اسے زرد بخار (YELLOW FEVER) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح زرد رنگ بیماری سے منسلک ہو گیا اور ایسے جہازوں پر جن میں کوئی مہلک بیماری پھوٹ نکلی ہو، دوسرے جہازوں کو یہ خبردار کرنے کے لیے کہ وہ اس کے پاس نہ آئیں پیلی جھنڈیاں لگادی جاتی تھیں۔

دوسری طرف سفید رنگت کو ابھارنے کے لیے بعض اوقات ہلکے پیلے پس منظر سے مدد لی جاتی ہے، جیسے جلد کی رنگت کو نکھارنے کی غرض سے دلہن کو ہلدی یا اُبٹن وغیرہ لگایا جاتا ہے اور محاورے میں ہاتھ پیلے کرنا کا مفہوم ہی شادی کرنا ہو گیا۔ سنسکرت میں پیلے کے لیے "پیت" (पीत) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ پیلی دھات جو تانبے اور جستے کو ملا کر تیار کی جاتی ہے "پیتل" کہلاتی ہے۔

آج کل ایسے اخباروں اور رسالوں کے لیے جو سنسنی پھیلا کر اور اسکینڈل چھاپ کر مقبولیت حاصل کرتے ہیں زرد صحافت (YELLOW JOURNALISM) کی اصطلاح سننے میں آتی ہے۔ یہ اصطلاح انیسویں صدی کے آخر میں ریاست ہائے متحدہ امریکا میں رائج ہوئی۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا "نیویارک ورلڈ" نامی اس رسالے کے سرورق کے حوالے سے ہوئی ہے جو کہ ۱۸۹۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اس سرورق پر ایک بچے کی تصویر بنی ہوتی تھی جس کا لباس زرد ہوتا تھا لیکن یہ اصطلاح ۱۸۹۸ء کے قریب اس وقت عام ہوئی جب اخبارات میں اس سنسنی خیز افواہ کو نمک مرچ لگا کر چھاپا گیا کہ چین اور جاپان کی زرد اقوام اس قدر تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں کہ چند سالوں کے بعد وہ ان علاقوں پر چڑھ دوڑیں گی جہاں سفید اقوام بستی ہیں اور سفید اقوام کو تہہ وبالا کر دے گی۔ اس کے بعد جارحانہ قسم کی قوم پرستی، سطحی قسم کی سنسنی اور بے سبب اشتعال اور ہیجان پیدا کرنے والی صحافت کو زرد صحافت کے نام سے پکارا جانے لگا۔

ملک وے نے زوئیلا (VENEZUELA) کی راجدھانی کراکس میں بنی صدر کی رہائش گاہ کو "قصرِ عنبریں" (CASA AMARILLA) یعنی زرد محل کہا جاتا ہے۔ اس سے

ریاست ہائے متحدہ امریکا کے صدر کی رہائش گاہ "وہائٹ ہاؤس" کی یاد آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے وہائٹ ہاؤس شروع سے سفید نہیں۔ اس عمارت کو امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن نے ۱۷۹۳ء میں شہر واشنگٹن ڈی سی میں بنوانا شروع کیا تھا لیکن ۱۷۹۹ء میں ان کی موت تک یہ مکمل نہیں ہوئی۔ ان کے جانشین جان ایڈمس نے اس میں ۱۸۰۰ء میں سکونت اختیار کی۔ ۱۸۱۴ء میں انگریزوں کے حملے میں ریتیلے پتھر کی اس عمارت کو جزوی طور پر نقصان پہنچا اور اس کی دیواریں توپوں کے حملے میں بُری طرح جھلس گئیں۔ اس نقص کو چھپانے کی غرض سے اس پر سفیدی کی گئی اور تب سے یہ عمارت وہائٹ ہاؤس کہلاتی ہے۔ امریکی مورخین اس حملے میں انگریزوں کے غلبے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور وہ اس طرح لکھتے ہیں جیسے یہ عمارت ہمیشہ سے سفید ہے۔

پیلا، نارنجی یا سنہری رنگ دور سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سڑکوں پر ٹریفک بتیوں میں "ٹھہرو" کا اشارہ دینے کے لیے پیلے رنگ کی روشنی سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس غرض سے کہ کاروں کے ہجوم میں ٹیکسی کو دور سے پہچانا جا سکے اسے یا کم از کم اس کی چھت کو پیلے رنگ سے پینٹ کیا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کے "بلیک باکس" کو بھی نارنجی رنگ سے پوتا جاتا ہے تاکہ وہ جہاز کے ملبے میں دور سے دکھائی دے۔

دبے ہوئے رنگ جیسے بھورا، گیروا، کیسریا اپنے اندر گرد و غبار کو سمو لیتے ہیں۔ اس لیے چمڑے کے جوتوں، تسموں، وغیرہ پر اکثر بھورے یا براؤن رنگ کا پالش کیا جاتا ہے۔ اس طرح سادھو سنیاسی بھکشو جنھیں کہیں بیٹھ جانے یا لیٹ جانے میں کوئی تامل نہیں ہوتا وہ گیروے یا کیسریا رنگ کے کپڑوں کو ترجیح دیتے ہیں اور اس قسم کے رنگوں کو تیاگ، دنیا سے بے تعلقی اور زیب و زینت سے بے نیازی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔